سہ پہر کی خزاں
رشید امجد
Hameed Saghar

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

سہ پہر کی

فراق

سہ پہر کی خزاں

رشید امجد

کتاب ---------- سہ پہر کی خزاں
مصنف ---------- رشید امجد
سرورق اور
اندر کی ڈرائنگز ---- حمید ساحر
ناشر ---------- اعجاز راہی
مطبع ---------- مارگلہ پرنٹرز۔ راولپنڈی
پہلی چھاپ ---- مئی ۱۹۸۰ء
تعداد ---------- ایک ہزار
قیمت ---------- پندرہ روپے

دستاویز پبلشرز
راولپنڈی

سعدیہ کے نام

ترتیب

۱۹۷۸ء — ۱۹۸۵ء

گملے میں اُگا ہوا شہر

جنازے کا جلوس جب بڑی سڑک سے قبرستان والی بغلی سڑک پر مڑا تو کراہوں کے تیز نکیلے ناخنوں نے فضا کے پرسکون چہرے کو نوچ نوچ کر لہو لہان کر دیا۔

اس نے گہرا سانس لے کر سینے پر بیٹھے ہوئے بوجھ کو ایک طرف کھسکانے کی کوشش کی، اور اسی لمحہ معاً اسے احساس ہوا کہ جنازہ موجود نہیں ہے۔ اس نے ایڑیوں کے بل اُچک کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آگے، پیچھے، دائیں بائیں، جنازہ کہیں نہیں تھا۔

"جنازہ کدھر گیا؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور سر گھما کر ساتھ والے کی طرف دیکھا۔ اس کے دائیں بائیں کئی لوگ سر جھکائے، گہرے سانس لیتے سینوں پر رکھے بوجھوں کو اِدھر اُدھر کھسکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ایڑیوں کے بل اُچک کر پھر ایک نگاہ دوڑائی لیکن جنازہ نظر نہ آیا۔

"بھائی صاحب ...." اس نے ساتھ والے کی طرف دیکھا —— ساتھ والے نے سر اُٹھا کر اسے گھورا اور منہ نیچے کر لیا۔

"بھائی صاب ...." ساتھ والے نے اسے پھر گھورا۔

"..... جنازہ گم ہو گیا ہے ...." اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

"کیا ...؟ کیا گم ہو گیا ہے؟" ساتھ والے نے پہلے اس کی طرف دیکھا پھر سامنے دیکھا اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا: "ارے، جنازہ کہاں گیا ...؟"

آس پاس کے لوگوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر سامنے دیکھا: "ارے ...."

"جنازہ کدھر گیا ...؟"

"جنازہ کدھر گیا ...؟"

افراتفری ایک ہی لمحہ میں جست لگا کر ان کے درمیان آن کھڑی ہوئی اور بال کھول کر دھمال ڈالنے لگی۔

آدھا جلوس بڑی سڑک پر اور آدھا بغلی سڑک پر۔ حیرانی کے فوکس میں قید چہرے، دائرے میں چکر لگاتے سوال۔

اس نے ذہن پر زور دے کر گزرتے لمحوں کی دوڑ پکڑنے کی کوشش کی —— بڑے میدان میں مرنے والے کو سولی سے اُتار کر جنازے کی ڈولی میں ڈالا گیا تھا۔ اس نے اُچھل اُچھل کر ارد گرد کھڑے لوگوں کے سروں سے اوُپر اٹھ کر خود اسے دیکھا تھا۔ انسانوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندر میں ان گنت کندھوں سے ہوتا ہوا جنازہ بڑی سڑک پر جسے مرکزی شاہراہ نمبر ایک کہتے تھے لایا گیا تھا۔

اس نے آگے پیچھے مڑ کر دیکھا —— لوگ گروہوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: "جنازہ کہاں گیا؟"

اس نے نئے سرے سے لمحوں کو جوڑنا شروع کیا —— لوگوں کو اس کی موت کی اطلاع صبح سویرے ہی مل گئی تھی۔ سرگوشیاں رقص کرتی سارے شہر میں پھیل گئی تھیں۔ دوکانیں کھلی ہی نہیں تھیں یا صبح ہی بند ہو گئی تھیں اور سڑکیں سنسان۔ لوگ بڑے میدان میں جمع ہو گئے تھے —— جب جنازہ اٹھایا گیا تو آہیں موسلا دھار بارش کی طرح سارے شہر پر برس پڑیں۔

دوسرے بازار تک تو اسے یاد تھا، شاید اس کے بعد بھی اس کی نظر جنازے پر پڑی ہو لیکن وہ ٹھیک سے یاد نہیں کر پا رہا تھا کہ آخری بار اس نے جنازہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

لوگوں کی ٹولیاں اور گروہ شہر کی گلیوں میں اور سڑکوں پر جنازہ تلاش کر رہے تھے۔

وہ بغلی شاہراہ کی طرف چل پڑا —— چوک چوراہے، گلیاں، نکڑیں، ٹولیاں، گروہ۔ بس جنازے کی گمشدگی کی باتیں —— ہر کوئی اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔

"شاہراہ نمبر ایک کا موڑ کاٹتے تو میں نے خود دیکھا تھا۔۔۔۔"

"میں نے شاہراہ نمبر تین کے درمیانی چوک میں دیکھا تھا۔۔۔۔"

"میں نے بغلی سڑک کے موڑ سے سو گز ادھر دیکھا تھا۔۔۔۔"

لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جنازہ گم کہاں ہوا ہے؟

کیا معلوم، جنازہ اٹھایا ہی نہ گیا ہو اور لاش ابھی تک سولی پر ہی لٹک رہی ہو۔ اس کے دھیان میں آیا۔

کیا معلوم، یہ سب وہم ہو۔ سارا راستہ وہ سوتا آیا ہو اور اب جاگا ہو۔

یا پھر وہ اب جاگ رہا ہو اور جنازہ واقعی گم ہو گیا ہو۔

وہ بڑے میدان کی طرف بڑھنے لگا۔

اندھیرا شہر کو نرغے میں لے رہا تھا۔ اور رات کوئی دم میں شہر پر ٹوٹ پڑنے والی تھی ——— اور لوگ بھاگ رہے تھے، دوڑ رہے تھے۔

"کچھ پتہ چلا"؟ کسی نے کسی سے پوچھا، اسے کچھ پتہ نہ چلا۔

"نہیں۔۔۔" کسی نے کسی کو کہا، وہ کچھ جان نہ سکا۔

"بڑے میدان میں تو اندھیرا بھرا ہوا ہے۔۔۔" اس نے سنا اور اس کے قدم رُک گئے۔

دفعتاً بھاگتے دوڑتے لوگوں میں سے ایک، کوئی اس کی طرف مڑا: "تم کون ہو؟"

"مَیں۔۔۔ مَیں ہوں!" پھر اس نے چپکے سے اپنے آپ سے پوچھا: "مَیں کون ہوں؟" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔

"مَیں۔۔۔" اس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ دھندلاہٹوں میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے بس اتنا یاد آیا کہ لوگ ایک تابوت اٹھائے جا رہے تھے، اس تابوت میں۔۔۔

اس تابوت میں شاید وہ تھا، یا پھر شاید وہ نہیں تھا۔

اب بھی شک کے کلہاڑے ہاتھوں میں لئے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے پوچھ رہا ہے: "تم کون ہو؟"

"مَیں۔۔۔ مَیں۔۔۔" دوسرا جواب دینے کے لئے ذہن پر زور ڈالتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ دھندلاہٹوں میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے بس اتنا یاد آتا ہے کہ لوگ ایک تابوت اُٹھائے جا رہے تھے، اس تابوت میں، اس تابوت میں شاید وہ تھا، یا پھر شاید وہ نہیں تھا۔

دو

جوں ہی قبر کھودنے کا کام مکمل ہوا۔ ان کے چہروں پر جگمگاہٹیں کروٹیں لینے لگیں۔

وہ پچھلے کئی مہینوں سے یہ قبر کھود رہے تھے ——— کبھی نیچے سے دلدل نکل آتی اور کبھی آسمان

پانی بن جاتا۔ قبر کھودنے کے دوران انھیں معلوم ہوا، اندر ہی اندر شہر کی زمین دل دل اور آسمان پانی ہو چکا ہے، مگر انھیں ہر صورت میں قبر کھودنا تھی۔ اور اب کہ قبر کھد چکی تھی، وہ مٹی کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ستا رہے تھے۔ ——— سلیں ترتیب سے ایک طرف پڑی تھیں، گارا بنانے کے لئے پانی سے لبالب بھری بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ بس ایک جنازے کا انتظار تھا۔

لمحوں کے سلسلے سرکتے رہے، کھسکتے رہے اور آخر قبر کھودنے والوں کی آنکھیں قبرستان کی طرف بڑھتا ہوا راستہ دیکھ دیکھ پتھرا گئیں ——— ڈوبتا سورج اور خالی قبر۔

پھر پُر اسرار سناٹے کے تنے ہوئے خیمے سے دفعتاً ایک آواز گونجی ——— جنازہ گم ہو گیا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔ سروں پر منڈلاتی رات نیچے اترنے لگی۔

قبر کھودنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا :"...لیکن اب ہم دفن کیسے کریں گے ؟"

"دفن ---- ؟" دوسرا چونکا۔

"ہاں قبر کھد جائے تو پھر لاش مانگتی ہے ----!"

سب نے ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھا ——— نیچے اترتی رات روشنی کو دبوچ رہی تھی اور خالی قبر اپنی جسامت سے کہیں بڑی دکھائی دے رہی تھی۔

"... لیکن لاش کس کی ؟" ایک بڑبڑایا۔

"کوئی بھی لاش ---- کھدی ہوئی قبر تو بس مُردہ مانگتی ہے ----"

"ایک لاش ----"

"کوئی بھی لاش ----"

سرگوشیوں کے کندھوں سے سوال پھسلا، قبرستان سے نکلا اور رینگتا رینگتا سارے شہر میں پھیل گیا ——— چوک، چوراہے، بازار، گلیاں، نکڑیں، ٹولیاں، گروہ۔ چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتی ہوئی آنکھیں ——— رات نیچے اتر آئی تھی، اور بال کھولے شہر میں پھر رہی تھی۔

ایک ایک کر کے ہر شخص سہمے ہوئے گھروں میں کھو گیا، جہاں بچے اور عورتیں پہلے ہی رو رو چپ ہو چکی تھیں۔

وہ شاید گھر میں تھا۔ یا پھر شاید گھر میں نہیں تھا۔

"۔۔۔۔ اتنی دیر ؟" شاید اس کی بیوی نے کہا، یا پھر شاید اس کی بیوی نے نہیں کہا۔

"کھدی ہوئی قبر تو بس لاش مانگتی ہے۔۔۔۔ لاش نہ ملے تو شہر تباہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔!"

دونوں میں سے شاید کسی نے کسی سے کہا، یا پھر شاید دونوں میں سے کسی نے کسی سے نہیں کہا۔

"کیا۔۔۔۔ ؟" شاید دونوں نے بیک وقت کہا، یا پھر شاید دونوں نے بیک وقت نہیں کہا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔" دونوں نے شاید بیک وقت جواب دیا، یا پھر شاید دونوں نے بیک وقت جواب نہیں دیا۔

دونوں شاید ایک ساتھ ایک بستر پر تھے، یا پھر شاید دونوں ایک ساتھ ایک بستر پر نہیں تھے —— نیند شاید ان کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی، یا پھر شاید نیند ان کی آنکھوں میں بھری ہوئی نہیں تھی۔

باہر رات شاید اپنے بال باندھ رہی تھی، یا پھر شاید باندھ نہیں رہی تھی —— سورج ایک آنکھ کھولے شہر کو دیکھ رہا تھا، یا پھر شاید شہر کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

شاید اندھیرے میں، شاید روشنی میں —— یا پھر شاید نہ اندھیرے میں، نہ روشنی میں، کھدی ہوئی قبر اپنی جسامت سے بہت بڑی ہو گئی تھی اور لاش مانگ رہی تھی۔

شاید دن گزر گیا۔ یا پھر شاید نہیں گزرا۔

شاید رات پھر آگئی، یا پھر شاید نہیں آئی۔

شک ان کے بدنوں کے ادھڑے بوسیدہ دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ خالی منظر ان کی بوڑھی نظروں کو نوچ رہا ہے۔ بھوک ان کی انتڑیوں کو بل دے رہی ہے —— اور ایسے میں وہ سب، سب کے سب، ان میں سے ہر کوئی، وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے کسی دوسری آنکھ کے جھپکنے کا منتظر ہے کہ کھدی ہوئی قبر تو بس لاش مانگتی ہے۔۔۔۔

سناٹا بولتا ہے

معلوم نہیں یہ رات کا پہلا پہر ہے، درمیانہ یا پچھلا،
یا شاید دن ہے جس نے رات کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے؛
یا پھر شاید رات ہی ہے،
کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی، خوفناک جبڑوں والا اندھیرا تھوتھنی اٹھا اٹھا کر بھونک رہا ہے؛

وہ سہم کر میرے ساتھ لگ جاتا، اور سرگوشی کرتا ہے ——— "ماچس جلاؤں؟"
"نہیں، تیلیاں اس طرح ختم ہوتی رہیں تو ———"
"تو؟" اس کی آواز میں خوف سرسراتا ہے۔
"——— میں نہیں جانتا۔"

شاید ایک دو یا اس سے بھی زیادہ دن، مہینے یا سال، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم کب سے گٹر کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں، اتنا سا خیال آتا ہے کہ ہم گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے ——— مین ہول کھلا ہوگا، وہ گرا، اسے نکالنے کی کوشش میں میں، یا شاید میں گرا ہوں گا اور مجھے نکالنے کی کوشش میں وہ، پورے یقین کے ساتھ کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی؛

رینگتے پانی کی سرسراہٹ، اندھیرا بار بار اپنے جبڑے کچکچاتا ہے اور لمبی کالی زبان نکال کر ہمارے منہ چاٹتا ہے، ہماری گالوں پر لیس دار رات کی چپچپاہٹ، وہ تیلی جلاتا ہے، بیمار نحیف شعلہ سر اٹھا کر دو تین اکھڑے اکھڑے سانس لیتا ہے ——— گپ اندھیرا،
زیادہ گہرے اور منظم اندھیرے میں تھوڑی سی غیر منظم روشنی اندھیرے کو اور دبیز کر دیتی ہے؛

اوپر سڑک پر بھاری تیز رفتار گاڑی گزرتی ہے۔

میں کہتا ہوں ـــــ "اس کا مطلب ہے ہم ابھی بڑی سڑک کے نیچے ہی ہیں"

وہ ہنستا ہے ـــــ "اس صورتِ حال میں بڑی سڑک کے نیچے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"شاید کچھ نہیں، لیکن یہ احساس بھی غنیمت ہے"

"اگر ہم اسی سیدھ میں چلتے جائیں تو شاید کوئی کھلا ہوا مین ہول نظر آجائے"

"اس سیدھ میں تو شاید ہی ملے" وہ بڑبڑاتا ہے ...... "بہرحال چلے چلو"

ہم ابھی دو چار قدم ہی چلتے ہیں کہ کوئی چیز میرے پاؤں سے لپٹ جاتی ہے، میں جھک کر چھوتا ہوں ـــــ ننھا منا سا ایک ہاتھ۔

"ماچس جلاؤ ـــــ جلدی" میں چیختا ہوں۔

لرزتی روشنی میں ایک نوزائیدہ بچہ میرے پہلو سے گزرتا آگے نکل جاتا ہے۔

وہ کہتا ہے ـــــ "یہ تو میرا بچہ ہے ـــــ مگر یہ تو ابھی ماں کے پیٹ میں تھا"

میں اسے تسلی دیتا ہوں ـــــ "شاید اس دوران اس کی ماں نے اسے جن دیا ہو"

"اور پھر کسی نالی میں پھینک دیا ہو" وہ بڑبڑاتا ہے ـــــ "یا پھر یہ کہ اس کی ماں نے اسے کسی نالی ہی کے کنارے جنا ہو اور بہتا ہوا یہاں آگیا ہو"

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد وہ دفعتاً چیختا ہے ـــــ "میرے بیٹے ـــــ میرے بچے"

جواباً رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور لیس دار اندھیرے کی چپچپاہٹ۔

"میرا بچہ ـــــ میرا بیٹا" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

"صبر کرو ـــــ صبر" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں ـــــ "سارے بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے بچوں کو یوں ہی نالیوں میں بہائیں گی"

"نالیوں میں کیوں؟" وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے۔

"دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں، اور شہر میں قتلِ طفلاں کی منادی بھی ہو چکی ہے مائیں بے چاری کیا کریں ـــــ چلو آگے چلیں، کسی کھلے مین ہول کی تلاش میں"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے —— "میری عمر اب چالیس سال ہونے والی ہے، اس سیلن زدگی، رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اس لیس دار اندھیرے کے جبڑوں میں پستے پستے چالیس سال ہو چکے ہیں؛ معلوم نہیں میری زندگی کے اور کتنے سال باقی ہیں، ان باقی سالوں میں کھلا مین ہول ملے گا بھی کہ نہیں۔"

"کیا معلوم —— ؟" میری آواز دم توڑ رہی ہے —— "شاید ہمارے بچوں کو مل جائے، یا شاید وہ بھی ہماری ہی طرح ساری زندگی کھلے مین ہول کے خواب دیکھتے دیکھتے اسی گٹر میں بھٹکتے، اندھیرے کے لیس دار جبڑوں میں پستے گزار دیں۔"

"چلو آگے چلیں" وہ میرا ہاتھ دباتا ہے۔

گہری گپ خاموشی، جس میں رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اندھیرے کے خراٹے گونج رہے ہیں؛

ہمارے سروں پر آوازوں کے بادل تیر رہے ہیں۔

ایک آواز —— "میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

دوسری آواز —— "وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔"

تالیاں، نعرے، تحسین کا شور؛

وہ کہتا ہے۔ "بادشاہ نے بادشاہ کے ساتھ جو سلوک کرنا تھا کر دیا، مگر ہم کہاں ہیں؟"

"ہم ——" میں اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوں —— "بادشاہوں کے کھیل میں ہم کوئی چیز نہیں ہوتے، بس ہم تو کھلے مین ہول کے خواب ہی دیکھتے ہیں۔"

وہ پوچھتا ہے —— "ہم میں سے پہلے کون گٹر میں گرا تھا۔"

"تم ——" میں اندھیرے میں اسے گھورتا ہوں

"نہیں تم ——" وہ دو قدم پرے ہو جاتا ہے۔

"نہیں تم ——"

"تم ——" وہ مجھ پر جست لگاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں جب تھک جاتے ہیں تو آمنے سامنے کی دیواروں سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگتے ہیں۔

بہت دیر کی چپ کے بعد وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہے ——— "آگے چلیں"

"چلو ———"

چلتے چلتے ہم ایک کھلی سی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ سخت سے ٹکڑے ہمارے پاؤں سے ٹکراتے ہیں۔

وہ ماچس جلاتا ہے۔

چاروں طرف ہڈیاں اور انسانی پنجر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ہڈی اٹھالیتا ہے اور کہتا ہے ——— "یہ تو میرے باپ کی ہڈی لگتی ہے، اس کے جبڑے کی ساخت ایسی ہی تھی۔"

میں انسانی پنجروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ کہتا ہے ——— "لو جی میں سمجھتا تھا میرا باپ مجھ سے اچھا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح ساری عمر کھلے مین ہول کے خواب دیکھتا رہا۔"

دفعتہً اس کی آواز لرزنے لگتی ہے ——— "ہم بھی ——— ہم بھی ———"

میں جھک کر دیکھتا ہوں، سب کے منہ پر پلاسٹر ٹیپ لگے ہوئے ہیں، کیڑے ان کا گوشت کھا گئے ہیں، مگر ٹیپ اسی طرح ہیں۔

"مگر ہم تو صرف اظہار کے حوالہ سے ہی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور ان کے منہ تو بند ہیں ——— بند کر دیئے گئے ہیں۔"

پانی کی سرسراہٹ، بل کھاتی سیلن

ایک گوشت خور کیڑا اس کی ٹانگ پر چڑھ جاتا ہے، وہ چیخ مارتا ہے اور ٹانگ جھٹک کر آگے چل پڑتا ہے ———

ابھی دو چار ہی قدم اٹھتے ہیں کہ بہت سی ملی جلی آوازیں اندھیرے میں سے نکل کر ہمارے پاؤں پکڑ لیتی ہیں۔

وہ جلدی سے تیلی جلاتا ہے۔

ننگ دھڑنگ بچے، پانی میں شپ شپ کرتے دوڑے چلے آرہے ہیں۔

"یہ کون ہیں؟" وہ میرے ساتھ لگ جاتا ہے۔

ایک بچہ جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے آگے بڑھ کر پوچھتا ہے ـــــ "تم کون ہو؟"

"ہم ـــــ ہم گٹر میں گر پڑے تھے"

"اور یہ کہ تمہارا پاؤں پھسل گیا تھا" وہ کھڑکھڑاتا ہے ـــــ "سب یہی کہتے ہیں"

"مگر تم کون ہو؟"

"ہم ـــــ ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں، اس گٹر کے اندر"

"ربڑ کے غبارے"

"ہاں وہ غبارے جو لوگ استعمال کر کے گٹر میں پھینک دیتے ہیں"

وہ شور مچاتے، ہمارے دائیں بائیں سے گزرتے ادھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ـــــ

'مجھے یاد آیا ۔ ایک رات میری ماں نے بھی ایک غبارہ نالی میں پھینکا تھا اور اس میں میں تھا، پر معلوم نہیں وہ شخص جو راتوں رات ہی چپکے سے چلا گیا تھا میرا باپ تھا کہ نہیں"

"اور شاید میں بھی اسی غبارے میں تھا؛ اور وہ شخص، وہ ضرور ہمارا باپ تھا۔ اور وہ ہماری ماں تھی ـــــ انہوں نے تو ہمیں بہت روکا تھا، مگر ہم خود ہی اس گٹر میں آگئے ہیں یا شاید ہمیں ورغلایا گیا تھا ـــــ سنہرے خواب دکھا کر، مگر یہاں آکر معلوم ہوا یہ تو گٹر ہے ـــــ گٹر"

اوپر اب آوازوں کی دستک میں بھاری پن اور تواتر پیدا ہو رہا ہے؛

"شاید اوپر صبح ہو چکی ہے" میں بڑبڑاتا ہوں

"مگر ہمیں کیا؟" اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے،

"سورج کی شکل کیسی ہوگی؟" میں اس سے پوچھتا ہوں ـــــ "اس کی کرنوں میں گرمی تو ہوتی ہوگی نا"

"اب تو یاد بھی نہیں ـــــ اور میرے منہ پر تو ٹیپ لگا ہوا ہے، اور ایسی باتیں کرنا منع بھی ہے، میں تمہیں کیسے بتاؤں، کیا بتاؤں؟"

ہم اس وقت کسی بڑی سڑک کے نیچے ہیں۔ ہارنوں کی پوں پوں، بریکوں کی رگڑ اور قدموں کی آوازیں ـــــ

وہ تیلی جلاتے ہوئے اعلان کرتا ہے ـــــ "صرف دو تیلیاں باقی ہیں"

لرزتی روشنی میں ایک عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے،
وہ حسرت سے اوپر دیکھتا ہے —— "کہیں بھی کوئی راستہ نہیں"
"نقشوں میں ضرور ہوگا" میں سوچتا ہوں —— "مگر نقشے تو صرف دیواروں پر لگانے کے لئے ہوتے ہیں"
"یہ ہوا میں تازگی کیسی ہے۔؟" وہ چونکتا ہے
"کیا معلوم یہ تازگی ہے بھی کہ ہم ہی اس سیلن زدگی کے عادی ہوگئے ہیں؟"
"نیم روشنی، نیم تازگی —— ہم بھی تو نیم زندہ ہی ہیں"
اوپر اب دوپہر گزر رہی ہوگی
اب سہ پہر —— اب سانولی نمکین شام،
لوگ دفتروں، دکانوں سے گھر آرہے ہوں گے، دروازوں پر منتظر بیویاں مسکراہٹوں کے بوسے لئے ان کی راہ تک رہی ہوں گی —— ابو ابو کرتے ننھے بچے اپنی توتلی زبانوں کے ساتھ انہیں پکار رہے ہوں گے،
تیلی جلاتے ہوئے وہ اعلان کرتا ہے —— "بس ایک ہی تیلی باقی ہے"
"اسے مت جلانا —— مت جلانا" میں چیختا ہوں
"کیوں؟"
"بس اسے جلانا مت"
"کیوں نہ جلاؤں؟" وہ ضد کرتا ہے —— "وجہ بتاؤ"
"آخری لمحے میں، جب ہم ایک دوسرے کی آخری تصدیق کریں گے تو اس وقت —— اس وقت"
اوپر نعروں کا شور —— میری آواز ڈوب جاتی ہے۔
مقرر کی چیختی آواز، مگر لفظ فضا ہی میں رہ جاتے ہیں۔
وہ افسوس سے سر ہلاتا ہے —— "کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا"
"معلوم نہیں لفظوں ہی میں سے معنی نکل گئے ہیں، یا آوازیں کھوکھلی ہوگئی ہیں، خدا جانے کہاں کیا گڑبڑ ہے"

شور —— چیختی آوازیں،
پھر تڑ تڑ —— گولیوں کی تڑ تڑ
سناٹا بولتا ہے،
وہ کہتا ہے —— "ہم شہر میں ہیں اور گٹر نیچے ہے"
میں کہتا ہوں —— "ہم گٹر میں ہیں اور شہر اوپر ہے"
اب معلوم نہیں، یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم گٹر میں ہیں یا شہر میں، شہر میں ہیں یا گٹر میں،
وہ کہتا ہے —— "لو یہ جھگڑا چھوڑو، میں آخری تیلی جلانے جا رہا ہوں"
میں سوچتا ہوں، چند لمحے چپ رہتا ہوں پھر آہستہ سے کہتا ہوں —— "اچھا"
وہ تیلی کو ماچس پر رگڑتا ہے،
ایک دوسرے کو دیکھنے، شناخت کرنے اور ایک دوسرے کی گواہی دینے کا یہ آخری موقعہ،
مجسم آنکھ بنے، آمنے سامنے —— ٹک ٹک، ٹک ٹک
تیلی ماچس سے رگڑ کھاتی ہے،
ہمارا سارا وجود آنکھ میں ڈھل جاتا ہے۔
وہ تیلی کو ماچس سے رگڑتا ہے —— رگڑتا چلا جاتا ہے۔
تیلی بغیر جلے، ٹوٹ کر نیچے پانی میں جا گرتی ہے۔
سرسراتے اندھیرے اور رینگتے پانی میں، آنکھیں پھاڑے ہم ایک دوسرے کو دیکھنے،
شناخت کرنے اور ایک دوسرے کی گواہی دینے کے انتظار میں پتھر ہوتے جاتے ہیں!

قبرستان کی آمنے سامنے کی دیواروں پر بیٹھے ہوئے وہ اور میں،
درمیان میں چُپ قبرستان،
یہ پت جھڑ کا موسم ہے:
پیاسے درختوں کے بنجر ہاتھوں سے وقفہ وقفہ سے پھسلتے پتے ویران قبروں پر خاموشی سے گرتے ہیں؛ ہوا رکی ہوئی ہے اور فضا میں کبھی کبھی کسی اداس پرندے کی آواز لمحہ بھر کے لئے نشان بناتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے۔
تھکاوٹ سے چور راستے قبروں کے درمیان چپ چاپ لیٹے ہوئے ہیں۔
وہ ایک لمبی تیز سسکاری جیسی آواز نکالتا ہے۔
"کیا بات ہے؟" میں چیخ کر پوچھتا ہوں۔
"کچھ نہیں، میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں موجود تو ہوں نا"
گہری چُپ
مجھے اس پر رشک آتا ہے کہ وہ موجود ہے اور خود پر شبہ ہوتا ہے کہ میں موجود نہیں۔
میرے منہ سے بے ساختہ لمبی اُو نکلتی ہے۔
"میں بھی موجود ہوں" میں چیخ کر اسے بتاتا ہوں۔
سانولی نمکین شام آہستہ آہستہ ہمارے درمیان رات کا جالا بُن رہی ہے۔
میں دیوار سے کھسک کر آہستہ سے نیچے اترتا ہوں۔
دھندلی شام میں وہ بھی نیچے اترتا ہے۔
میں سامنے والی قبر کا کتبہ اٹھا کر آواز دیتا ہوں —— "کوئی ہے؟"
میری آواز قبرستان کے دوسرے سرے سے واپس آتی ہے۔

وہ پکارتا ہے ——— "کوئی ہے ؟"

میں اگلی قبر کا کتبہ اٹھاتا ہوں۔

قطار در قطار ویران قبریں ——— خالی کھوکھلی آوازیں

میں قبرستان کے دوسری طرف نکل آتا ہوں اور آہستہ سے دیوار پر جا بیٹھتا ہوں۔

وہ بھی دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔

قبرستان کے آمنے سامنے کی دیواروں پر بیٹھے میں اور وہ،

درمیان میں قبرستان،

یہ پت جھڑ کا موسم ہے!

درختوں سے جھڑتے پتے اداس قبروں اور چپ راستوں پر لڑکھڑا رہے ہیں۔

شام کی جھولی میں سمٹا اندھیرا دبے پاؤں باہر نکل کر چپکے چپکے چاروں طرف پھیل رہا ہے۔

قبرستان کی آمنے سامنے کی دیواروں پر بیٹھے ہم دونوں دھندلا رہے ہیں، مجھے وہ اب شام کے اندھیرے میں تحلیل ہوتا سایہ لگ رہا ہے،

میں آواز دیتا ہوں ——— "سامنے دیوار پر کون ہے ؟"

"میں" اس کی آواز گونجتی ہے۔

پھر وہ آواز دیتا ہے ——— "سامنے دیوار پر کون ہے ؟"

"میں" میں جواب دیتا ہوں۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا اقرار کر کے پھر کھسک کر دیوار سے نیچے اترتے ہیں۔ اور دبے پاؤں ایک ایک قبر کا کتبہ اٹھا کر اندر جھانکتے ہیں۔

سنسان خالی قبریں بھاں بھاں کر رہی ہیں۔

ہم چکر کاٹ کر دیوار کے پاس لوٹ آتے ہیں اور اچک کر بیٹھ جاتے ہیں۔

تاریخ میں لکھا ہے۔

انہوں نے خوابوں، چاہتوں اور جذبوں میں گوندھ گوندھ کر یہ شہر بنایا، اور گیت گاتے ہوئے اس میں داخل ہوئے، اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں، پھر چند دنوں کے

دشمنوں نے انہیں آن گھیرا کسی نے ان کے دل میں یہ شک ڈال دیا کہ دشمن ان کے شہر کو لوٹنا چاہتے ہیں، انہوں نے شہر کی حفاظت کے لیے سپاہی رکھے اور اپنی روٹی میں سے حصہ کاٹ کر انہیں دینے لگے

گہرا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا ہے۔

قبرستان کے آمنے سامنے والی دیواروں پر بیٹھے ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔

"میں ہوں" وہ ایک لمبی چیخ مارتا ہے۔

"میں بھی ہوں" میں جواب دیتا ہوں۔

ہم گھپ اندھیرے میں آوازوں سے اپنے ہونے کی تجدید کرتے ہیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھتے ہیں، تاریکی میں گم سم کھڑے درختوں کے پتے جھڑتے ہیں۔

ایک ایک کرکے،

ایک ایک کرکے،

میں دھیرے سے نیچے اترتا ہوں اور قبروں کے درمیان پھیلے ہوئے چپ راستوں پر چلنے لگتا ہوں۔

"ابو آئے" میری بیوی پکارتی ہے۔

"اکا — اکا" میری بیٹی واکر گھسیٹتی دروازے کی طرف لپکتی ہے۔

تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے۔

کہ سپاہی ان کے حصے کی روٹی کھا کھا کر خوب موٹے تازے ہو گئے اور ان کی تعداد شہر والوں سے زیادہ ہو گئی۔ وہ دشمن کا انتظار کرنے لگے، لیکن جب بہت عرصہ تک کسی طرف سے دشمن دکھائی نہ دیا تو انھوں نے خیالی دشمن کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر پھر بھی کام نہ بنا تو انہوں نے شہر والوں کو دشمن سمجھ لیا۔ اور کہنے لگے کہ ہم شہر والوں سے شہر کی حفاظت کریں گے۔

گاڑھا اندھیرا اور گاڑھا —— اور گاڑھا ہو گیا ہے۔

درخت، قبریں، راستے گم ہو گئے ہیں؛

جس دیوار پر میں بیٹھا ہوا ہوں وہ بھی کھو گئی ہے، مجھے اپنا آپ بھی نظر نہیں آرہا۔

میں صرف سوچ سکتا ہوں۔

میں چیخنا چاہتا ہوں، مگر میری آواز اندھیرا ہے۔

میں بولنا چاہتا ہوں، مگر میرے لفظ اندھیرا ہیں۔

میں سوچتا ہوں ــــ میں ہوں

اس سے آگے اندھیرا گاڑھا اندھیرا

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے والی دیوار پر بیٹھے ہوئے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں، مگر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا،

اندھیرا ہی اندھیرا

لفظ گم ــــ آواز گم ــــ وجود گم ؛

اور تاریخ میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے۔

ان کے سپاہی دشمن کو فتح کرنے کی تو سکت نہیں رکھتے تھے اس لئے اپنی بہادری کا بھرم رکھنے کے لئے خود ہی بار بار اپنے شہر کو فتح کرنے لگے اور شہر والے دشمن قرار پائے اور ان سے شہر کی حفاظت سپاہیوں کا مقدس فرض، سپاہیوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی، پھر دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ شہر والے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے اور صرف سپاہی ہی سپاہی رہ گئے، گلیاں اور مکان سونے ہو گئے اور رفتہ رفتہ بھربھر کرتی قبریں بن گئے۔

گھپ اندھیرے میں قبرستان کی آمنے سامنے کی دیواروں پر بیٹھے میں اور وہ جانے کب سے یوں ہی بیٹھے ہیں۔

گھپ اندھیرے میں الّو کی آواز ابھرتی ہے۔

کچھ دیر کے لئے وقفہ ہوتا ہے۔

پھر الّو کی تیز آواز مسلسل ہو جاتی ہے۔

درخت، قبریں اور راستے اس کی تیز آواز کے پردوں میں پھڑپھڑا کر چپ ہو جاتے ہیں۔

گہرا گھور اندھیرا،

میری بیوی مجھے شانے سے پکڑ کر ہلاتی ہے ــــ "اب سو بھی جائیں رات بہت ہو گئی ہے۔"

میں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

"آپ کیا سوچتے رہتے ہیں آج کل" وہ پریشانی سے پوچھتی ہے۔

میں جواب نہیں دیتا اور مڑ کر سوئی ہوئی بیٹی کو دیکھتا ہوں، جو اندھیرے سے بے خبر چوسنی منہ میں لئے مستقبل کے دھندلے زینے چڑھ رہی ہے اور نہیں جانتی کہ اس کے مستقبل کے سنہری خوابوں کے گرد خونخوار چہروں والے کتے غرا رہے ہیں۔

رات کے سناٹے میں الّو کی تیز آواز گونجتی ہے۔

اندھیرے میں مسلسل گونجنے لگتی ہے

یہ پت جھڑ کا موسم ہے۔

گھپ اندھیرا، درخت اداس،

سنسان راستوں پر پتے ایک ایک کر کے جھڑتے ہیں۔

اور الّو کی آواز مسلسل، تیز ——— اور تیز ——— اور تیز!

میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا
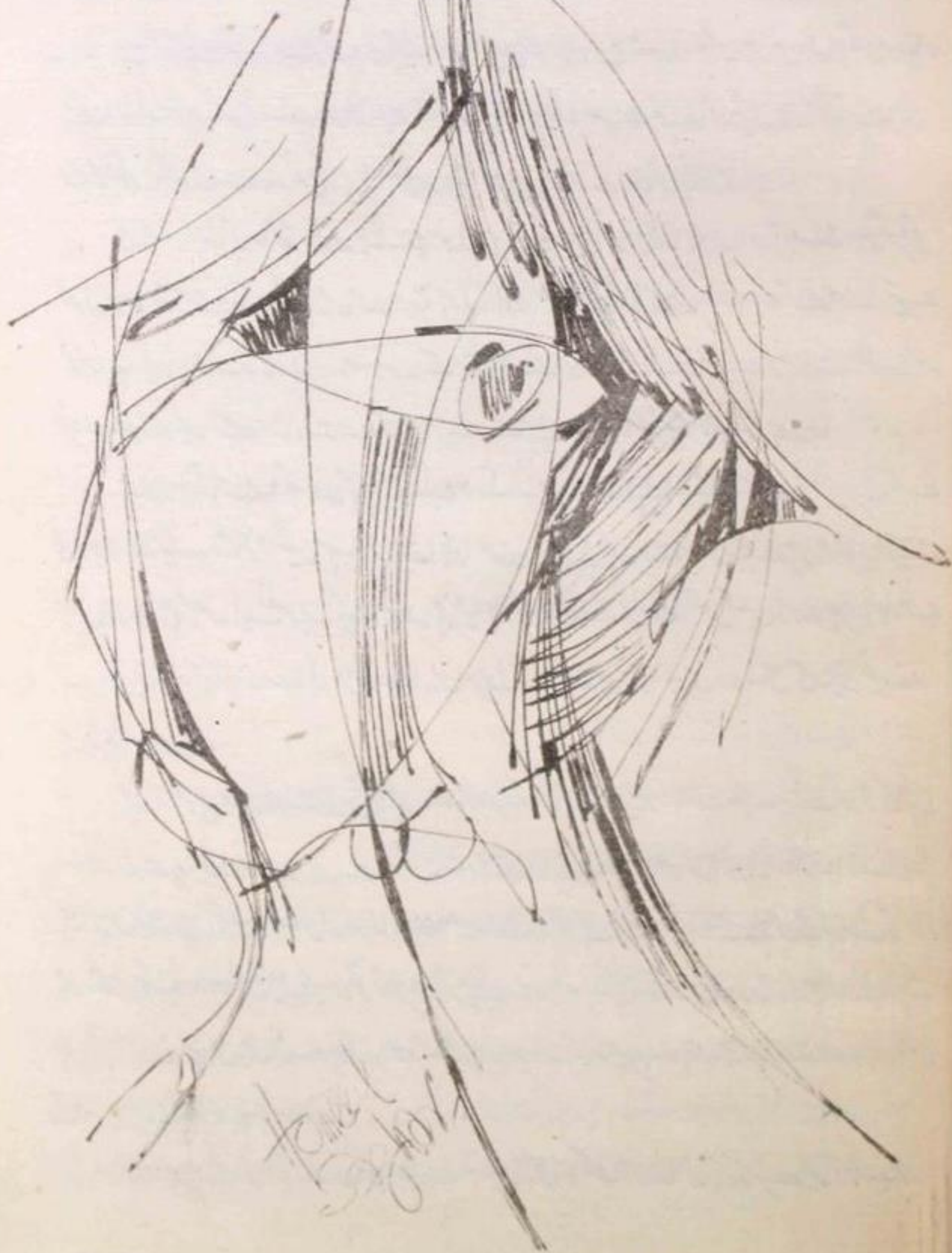
دن کے وقت سمندر میرے گھر سے تیرہ سو چھبیس کلومیٹر دور ہوتا ہے، لیکن جونہی رات گھنی سیاہ پلکیں اٹھا کر شہر کے چوک میں اترتی ہے، سمندر رینگتا رینگتا میرے کمرے کی دیوار سے آلگتا ہے۔ اور نرم لچیلی انگلیوں سے بند کھڑکی پر دستکیں دیتا اور میرا نام لے کر پکارتا ہے،

میں سر اٹھا کر ساتھ والے پلنگ پر سوتی بیوی اور بیٹی کو دیکھتا ہوں اور آہستہ سے کھڑکی کھول کر، ہاتھ سمندر کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ اور اس سے کہتا ہوں —— "اے سمندر، تیرے کئی روپ ہیں، انجانے دیسوں، روشنیوں کے، تاریکی کے ان گنت راستے تیرے وجود سے طلوع اور غروب ہوتے ہیں، مجھے بشارت دے کہ میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

سمندر ہنستا ہے، کھکھلا کر ہنستا ہے —— "مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ؟" میرے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر، ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا ہوا سمندر، کھڑکی میں سے سر نکالے میں، شاید حقیقت کہیں اور ہے ہم محض ایک تصویر، ایک عکس ہیں، یا پھر ہم حقیقت ہیں اور عکس کہیں اور دہرایا جا رہا ہے

بڑبڑانے کی آواز سنائی دیتی ہے، میں مڑ کر دیکھتا ہوں، میری دو سال کی بیٹی نیند میں بڑبڑا رہی ہے۔

مجھے آوازیں بہت سنائی دیتی ہیں مگر جسم دکھائی نہیں دیتے۔ وقت ایک پر کٹے کبوتر کی طرح میرے کندھے پر بیٹھا ہوا ہے، میں اسے ہُش ہُش کر کے اڑانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر وہ اڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں ہُش ہُش کرتا رہتا ہوں، میری بیوی مجھے بڑی احتیاط سے تہ کر کے کتابوں کی الماری میں رکھ دیتی ہے۔ لیکن میں اس کی نظر بچا کر چپکے سے باہر نکل آتا ہوں اور بڑے چوک کی طرف چل پڑتا ہوں۔ لیکن میں بڑے چوک سے آگے نہیں جا سکتا کہ میرے پاس جو اجازت نامہ ہے اس کی حد یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔

اس شہر میں پھول اگانے کی بھی اجازت نہیں کہ کلی کا کھلنا بھی فحاشی کے زمرے میں آتا ہے۔

سارے کام اجازت ناموں سے ہوتے ہیں مرنے کے لئے بھی اجازت لینا پڑتی ہے، اسی لئے میں مرنے سے پہلے مرنے کا ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں؛

میں نے کھڑکی پوری طرح کھول دی ہے اور سمندر کے کندھے پر پاؤں رکھ کر آہستہ سے نیچے اتر آیا ہوں۔ سمندر کے پھیلے جسم کے ساتھ کروٹ لے کر لیٹا ہوا ساحل سستا رہا ہے اور کن انکھیوں سے پرشور مہیب لہروں کو دیکھ رہا ہے۔ اوپر سیاہ آسمان، چمکتے تارے اور چاٹے کی پرچ جتنا بے جان چاند، پیچھے تاریکی میں ڈوبا ہوا شہر اور سامنے انگڑائیاں لیتا سمندر

ایک آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون؟"

"ایک آواز —— بغیر وجود کے ایک آواز"

"کون؟"

"ایک آواز —— ایک آواز"

آواز ایک چھناکے کے ساتھ ساحل پر گرتی ہے اور جسم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"کون؟"

"ایک وجود —— بغیر آواز کے ایک وجود"

"کون؟"

"ایک وجود —— ایک وجود"

وجود دوڑ کر سمندر کے سینہ پر چھلانگ لگاتا ہے اور پھر آواز بن جاتا ہے۔

آواز سے وجود اور وجود سے پھر آواز بن جانے کا کھیل،

کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر، پاؤں پھیلا کر لیٹا ہوا سمندر اور کھڑکی میں آدھا لٹکتا ہوا میں —— میں جو مرنے سے پہلے مرنے کا ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں، مگر میری بیوی مجھے احتیاط سے تہ کر کے کتابوں کی الماری میں رکھ دیتی ہے۔ شیشوں کی الماری میں سماعت سے محروم میں صرف دیکھ سکتا ہوں، بول نہیں سکتا، میں جلدی جلدی دو تین کتابوں کے پشتے ادھیڑتا ہوں، اور کپڑے کی دھجیوں میں اپنے کان اور آواز کو لپیٹ کر پوری طاقت سے چوک کی طرف اچھال دیتا

ہوں۔ شیشے چھناکے سے ٹوٹتے ہیں اور میرے کان اور آواز چوک میں عین اس چبوترے پر جا گرتی ہے جس پر چڑھا شخص مجمع کی طرف منہ کر کے چیخ رہا ہے ——— "میں خودکشی کر رہا ہوں"

مجمع میں سے سسکاریاں ابھرتی ہیں،

وہ شخص چبوترے کے درمیان لگے بجلی کے پول پر چڑھنے لگتا ہے۔ چکنے پول پر اس کے ہاتھ بار بار پھسلتے ہیں اور وہ چند فٹ اوپر جا کر پھر نیچے آجاتا ہے۔ مجمع کی نظریں اس پر جمی ہوتی ہیں۔ جونہی اس کے ہاتھ پھسلتے ہیں، مجمع اطمینان کا سانس لیتا ہے، لیکن جب وہ پھر چند فٹ اوپر کھسکتا ہے تو مجمع کی سانسیں رک جاتی ہیں۔ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش میں کئی قدم پھسلتا اور پھر دھڑم سے نیچے چبوترے پر، میرے کانوں کے قریب آگرتا ہے۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھتا ہے اور مجمع کی طرف منہ کر کے کہتا ہے۔ ——— "میں خودکشی کر رہا ہوں"

مجمع کے منہ سے سسکاریاں نکلتی ہیں۔

لوگ دوڑ کر ساحل پر آتے ہیں اور سمندر میں کود جاتے ہیں۔ لہروں پہ تیرتی آوازیں ساحل پر گر کر تپتی ریت میں وجود آشنا ہوتی ہیں اور چبوترے کے گرد پھر اتنا ہی مجمع جمع ہو جاتا ہے۔

چبوترے پر کھڑا شخص۔ لوگوں کی طرف منہ کر کے اپنے لفظ دہراتا ہے ——— "میں خودکشی کر رہا ہوں"

اور کھمبے پر چڑھنے، پھسلنے اور گرنے کا وہی عمل ———،

اس شہر کے لوگوں کو تاریخ بنانے کا بڑا چسکہ ہے مگر ان کا جغرافیہ روز بروز سمٹتا چلا جا رہا ہے ——— لیکن انہیں پرواہ نہیں۔ جغرافیہ رہے نہ رہے تاریخ ضرور بننی چاہیئے۔ رات اب آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

سمندر کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا اس دیوار تک آجاتا ہوں جو سمندر کو شہر سے جدا کرتی ہے۔ میں سمندر کی طرف سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میرے ہاتھ کائی زدہ چکناہٹ پر سے پھسل جاتے ہیں اور میں دھم سے سمندر کے قدموں میں آن گرتا ہوں، پھر اٹھ کر شہر کی طرف چل پڑتا ہوں جو تالاب میں بنا ہوا ہے۔

تالاب کے کنارے مزار کے گرد لگا ہوا میلا نشے میں جھوم رہا ہے، رنگ برنگی روشنیاں بھری ہوئی

دکانیں، سجے ہوئے پنڈال اور قہقہے لگاتے لوگ، میلا موج میں آکر ایک بھرپور انگڑائی لیتا ہے، اور اس کا پاؤں پھسل کر تالاب کے بھربھرے کناروں پر آپڑتا ہے۔ تالاب بہت پرانا ہے اور اس کنارے اتنے بھربھرے ہو گئے ہیں کہ وہ میلے کے پھسلتے پاؤں کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتے اور بیٹھ جاتے ہیں۔ میلا اپنے آپ کو سنبھالنے اور پھیلے ہاتھوں سے آس پاس کی اونچائیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، مگر تالاب کے پرانے اور بھربھرے کنارے اسے سنبھلنے نہیں دیتے اور میلا اپنی رنگ برنگی روشنیوں، بھری دکانوں سجے پنڈالوں اور قہقہے لگاتے لوگوں سمیت پلک جھپکنے میں تالاب میں جا گرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد تالاب سے یہ شہر اُگتا ہے، اور میں نہیں جانتا کہ کب یہ شہر بھی پھسل کر کسی تالاب میں جا گرے گا، اسی لئے تو میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ کر لینا چاہتا ہوں،

رات کے سیاہ بالوں میں اب چاندی پھولنے لگی ہے۔ میں اپنی کھڑکی میں واپس آجاتا ہوں۔ نیچے دلوار کے ساتھ ٹیک لگائے سمندر گہرے گہرے سانس لے رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سیدھا ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایک ہی لمبی چھلانگ لگا کر سمندر کے سینہ پر جا پڑوں، ابھی اپنے بازو کھولتا ہی ہوں کہ پیچھے سے میری بیوی بیٹی کی آواز آتی ہے ——— "ابو کا کر رہے ایں ؟"

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میری بیٹی، ادھ کھلی آنکھوں میں نیند لئے بازو پھیلائے مجھے بلا رہی ہے میں دھم سے بستر پر گر پڑتا ہوں۔ میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ نہیں کر سکتا، اور اب تھوڑی دیر بعد رات کے سارے سر میں سفیدہ کھل جائے گا، اور رات کے جوان مہکتے چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں پڑ جائیں گی، سفید رتھ پر سوار دن دوڑتا ہوا آئے گا اور سمندر جو اس وقت میرے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا کر سستا رہا ہے، پھر کھسک کھسک کر میرے گھر سے تیرہ سو چھبیس کلومیٹر دور چلا جائے گا اور میں اس میلے میں جو اپنی رنگ برنگی روشنیوں، دکانوں، سجے پنڈالوں اور قہقہے لگاتے لوگوں سمیت پھسل کر تالاب میں ڈوب گیا ہے، پھر اکیلا رہ جاؤں گا۔

کوڑا گھر میں تازہ ہوا
کی خواہش
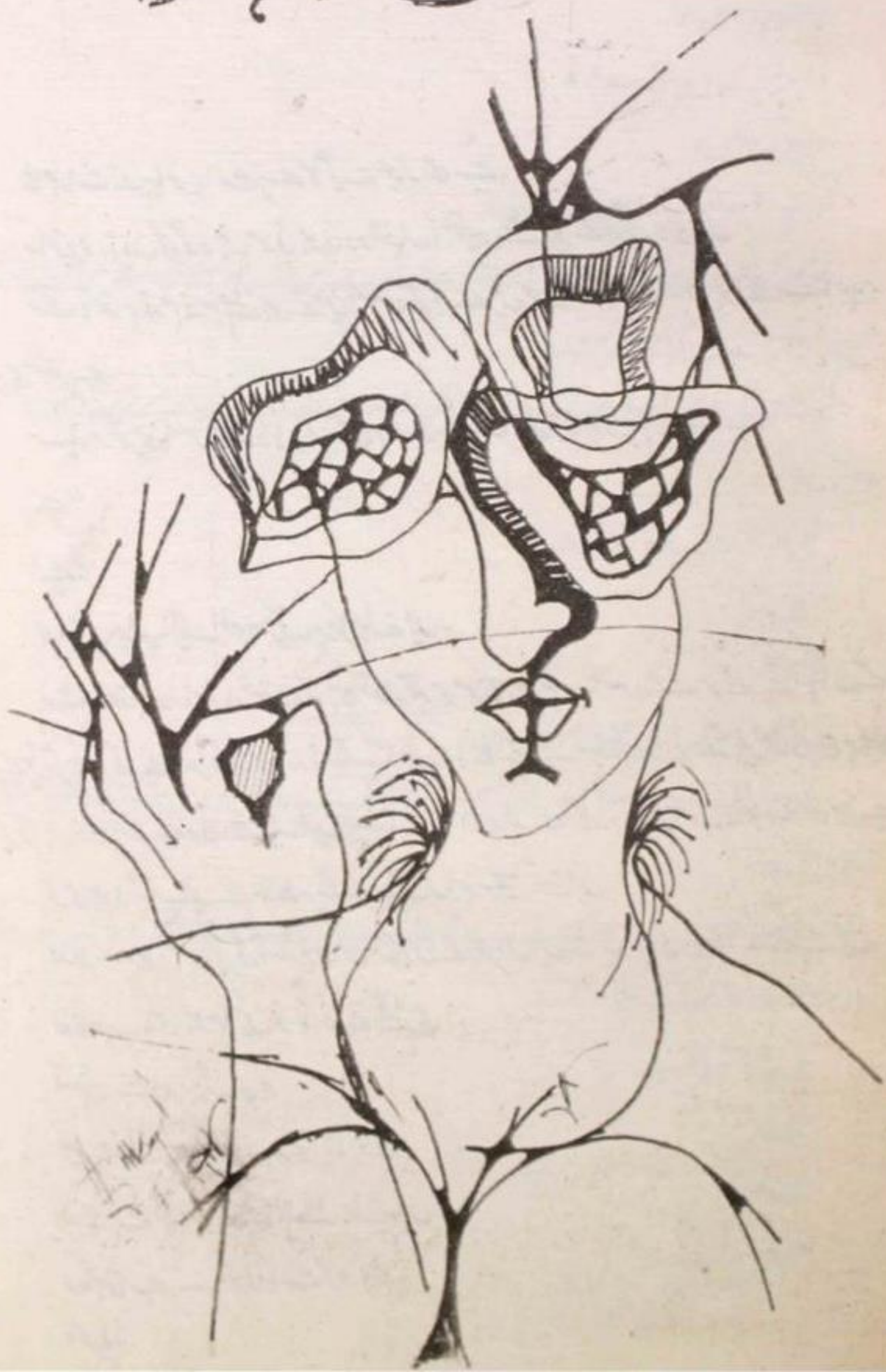
شام رات کے پیانو پر اندھیرے کا گیت بجا رہی ہے.

سائن بورڈوں کی گود میں سوتی ہوئی روشنیاں آنکھیں ملتے ہوئے جاگ رہی ہیں

فٹ پاتھ پر قدم قدم چلتے ہوئے میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں — وہ جو اگلے سٹاپ پر میری منتظر ہے۔

سیاہ برقعہ میں اس کا گدرایا بدن مجھے دور ہی سے اشارے کرتا اور سیٹیاں مارتا ہے۔

"ہے"

"ہے"

ہم چُپ چاپ ایک بغلی سڑک پر مڑ جاتے ہیں۔

فٹ پاتھ کے ساتھ درختوں کی لمبی قطار گہری سوچ میں گم، سانس روکے سوکھے پتے۔ پاؤں کے نیچے چُرمُر چُرمُر کی بے صدا آوازیں اور ٹریفک کا شور، باغ کے ایک نسبتاً ویران حصہ میں خالی بنچ پر بیٹھ کر کتابیں اور رجسٹر بے دلی سے ایک طرف پھینکتا ہوں. وہ برقعہ کے اگلے دو بٹن کھول کر لمبا سانس لیتی ہے

گری ہوئی کتاب میں سے لفظ رینگ رینگ کر باہر نکلنے لگتے ہیں.

لفظ — جو اس شہر کی الماریوں میں، کتابوں کے پنجروں میں بند قید تنہائی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

لفظ جب باسی ہو جائیں تو بُو دینے لگتے ہیں۔

تعفن سے لبریز گندی بُو

میں جلدی سے کتاب بند کر دیتا ہوں.

لفظ اپنے قید خانے میں سمٹ جاتے ہیں.

وہ کہتی ہے — "کوئی بات کرو؟"

"کیا"

"کچھ ہی"

"کیا"

"اچھا یہ بتاؤ یہ سڑک کہاں سے آتی ہے؟"

"معلوم نہیں"

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"معلوم نہیں"

"اچھا تو جو تمہیں معلوم ہے وہ بتاؤ"

"مجھے کچھ بھی معلوم نہیں، میری تو یادداشت ہی کمزور ہے۔ میں ایک لمحہ پہلے کی بات بھی بھول جاتا ہوں مجھے تو اس گزرتے لمحے کی بھی خبر نہیں"

پت جھڑ کی سوکھی بانہوں میں جکڑا باغ، پتھر کی ٹھنڈی سل، اور ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے ہم دونوں،

میں حاضری کا رجسٹر اٹھاتا ہوں۔

"یس سر"

"یس سر"

تو دراصل ہم یس سر کی مجسم صورتیں ہیں۔

ہر روز ایک بینڈ ماسٹر ہمیں نئی دھن پر ناچنا سکھاتا ہے، دھن تو وہی پرانی ہے، صرف ساز ہی نیا ہوتا ہے۔

بینڈ ماسٹر ہمیں پرانی دھن کے نئے انداز پر ٹرینڈ کرتا ہے اور جب خود ہی تھک جاتا ہے تو ساز کسی دوسرے کے حوالے کر کے چلا جاتا ہے۔

نیا بینڈ ماسٹر آتا ہے۔

"یس سر"

"یس سر"

"کوئی بات کرو نا"

میں اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر سیٹی بجاتا ہوں۔

وہ نیم پٹ کھول کر سرگوشی کرتی ہے — "کوئی دیکھ نہ لے۔"

"ہاں کوئی دیکھ نہ لے۔"

دیکھ لئے جانے کا خوف آسیب بن کر پورے شہر پر منڈلا رہا ہے۔

کوئی دیکھ نہ لے۔

بند کمروں میں بھی دیکھ لئے جانے کا تشنج

"کچھ تو کہو۔"

دُور کہیں سے گانے کی آواز اُبھرتی مدھم ہوتی پت جھڑ میں ڈوب جاتی ہے۔

زندگی تو ایک گیت ہے اور ہم اس گیت کے بے وزن مصرعے ہیں۔

"اچھا تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس بارے؟" وہ چونکتی ہے۔

"میرے ساتھ بھاگ جانے کے بارے میں"

وہ ہنس پڑتی ہے۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں تمہیں اغوا کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ چپ ہو جاتی ہے۔

گہری چُپ

کائی کا خاموش سمندر چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔

میں سائلنسر اُتری موٹر سائیکل پر پھٹ پھٹ کرتا آتا ہوں۔

آواز سن کر وہ کھڑکی میں طلوع ہوتی ہے۔

"چلو بھاگ چلیں۔"

وہ سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہائے کہتی ہے اور کھڑکی میں ڈوب جاتی ہے۔

گہرا ہوتا اندھیرا میرے پاؤں میں گدگدی کرتا ہے۔

"تو سارا مسئلہ رد انتوں کا ہے۔"

وہ سر جھکائے ناخن سے ناخن کریدتی رہتی ہے۔

میرے سر پر رکھا ٹوکرا ایک دم وزنی ہو جاتا ہے۔

سب نے وزنی ٹوکرے اٹھا رکھے ہیں۔

کسی کو نہیں معلوم ان میں کیا ہے۔

کچھ بھی نہیں

اندر سے تو یہ کب کے خالی ہو چکے ہیں، ہم تو صرف ان کی بوسیدگی کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔

"میں نے اس برقعہ کے نیچے جدید فیشن کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

یہ بات سارے شہر کو معلوم ہے لیکن پھر بھی سارے شہر نے برقعہ اوڑھا ہوا ہے۔

اپنے آپ سے بھی چھپنے کا شوق یا بیماری

میں کتاب اٹھا لیتا ہوں، چند سطریں پڑھ کر بند کر دیتا ہوں

لکھے ہوئے سارے لفظ زنجیریں ہیں۔

اور جو لفظ لکھے نہیں گئے، انہیں لکھنے کی جرأت نہیں۔

ہر شخص نے کپڑوں کے نیچے زرہ بکتر پہنی ہوئی ہے۔

وہ آہستہ سے میرے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دباتی ہے اور اٹھ کر روشنی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے

باغ کے وسط میں فوارے کے حوض کے پاس رُک کر، جھک کر ہم پانی میں عکس دیکھتے ہیں۔

ہمارے چہروں پر دھندلاہٹوں کے نیلگوں جزیرے ہیں۔

ہوا اپنی سرمئی انگلیوں سے ہمیں گدگداتی ہے لیکن ہمیں ہنسی نہیں آتی۔ شہر میں ہنسنے پر پابندی ہے

ہم ہنسے بغیر پوری سنجیدگی سے اپنے اپنے عکس کی مضحکہ خیزی کا تماشا کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں اس مضحکہ خیزی کا احساس بھی ہے۔

لیکن ہنسنے پر پابندی ہے۔

جانے میرے جی میں کیا آتا ہے۔ میں ہاتھ ڈال کر ٹھہرے ہوئے پانی کو ہلا دیتا ہوں۔ میرا اور اس کا عکس

پھیل کر، بکھر کر پانی پانی ہو جاتا ہے۔

بس اتنی سی بات ہے۔

ہم جو صرف جلتے عکس ہیں۔

وہ قریب سے گزرتے چنا جور گرم والے سے دو پڑیاں لیتی ہے۔

دانہ دانہ چُگتے ہوئے ہم ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔

دفعتہً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔

میں بھی ہنس پڑتا ہوں۔

ہنستے ہنستے ہم ایک دوسرے پر گر گر پڑتے ہیں۔

ہماری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں

"تو پھر"

"تو پھر اب چلیں شازیہ گھبرا رہی ہو گی"

ابو — ابو کرتی شازیہ ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے بند پپوٹوں پر دستک دیتی ہے۔

"چلو"

تیز تیز قدم اٹھاتے بس سٹاپ کی طرف جاتے ہوئے میں مڑ کر بیت جھڑ میں لپٹے درختوں پر ایک نظر ڈالتا ہوں، اور پھر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

میں اس عورت کو — جو میری بیوی ہے اغوا کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن — ؟

ریزہ ریزہ
شہادت

جس وقت وہ پہنچا گھوڑا پسلیوں کے بل فٹ پاتھ پر گر چکا تھا۔ اور دو وردیوں والے تتلی پکڑنے باغ میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ وہاں پہنچنے والا چوتھا شخص تھا۔ پہلے تینوں گھوڑے کے اردگرد کھڑے حیرت و تجسس اور دکھ کے ملے جلے جذبوں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ گھوڑے میں ابھی جان تھی، اور وہ اپنی درد بھری آنکھوں سے باری باری تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک پاؤں اٹھانے کی کوشش کرتا پھر تیزی سے نیچے گرا لیتا۔ باغ میں جو دو آدمی تتلی پکڑنے گئے تھے انہوں نے جال نکالا اور اس کے سرے، ڈوریاں ٹھیک کرنے لگے۔

اس نے باری باری تینوں کو دیکھا لیکن وہ سر جھکائے گھوڑے کی جانکنی کا تماشا کر رہے تھے

"کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا۔

سامنے والے نے جواب دینے کی بجائے کندھے جھٹکے اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ باقی تین بھی شانے اچکا کر رہ گئے۔ فٹ پاتھ کی دہلیز کے ساتھ رگڑ کا لمبا نشان پھیل کر سڑک تک آ گیا تھا اور گھوڑے کی پسلیوں سے بہتا خون اس میں رنگ بھر رہا تھا، گھوڑے نے ٹانگیں ہلا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر بے دم ہو کر اسی پہلو زمین پہ آ رہا۔

باغ میں گئے دونوں آدمیوں نے پھولوں کے گرد جال پھیلایا اور کونے میں بیٹھ کر تتلی کا انتظار کرنے لگے۔ اس نے جھک کر گھوڑے کی پسلیوں سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ زخم تو نظر نہ آیا البتہ رستے خون کی رفتار اس کے پھیلاؤ اور گہراؤ کو ظاہر کر رہی تھی۔ خون کا دھبہ اب سڑک کے درمیان آ گیا تیزی سے آتے سائیکل سوار نے خون دیکھ کر بریکیں لگائیں۔ "کیا ہوا۔" وہ سائیکل سے اترتے ہوئے بولا۔ چاروں چپ رہے۔ گھوڑا جانکنی کے عالم میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی غنودگی پھیل رہی تھی۔

باغ کے کونے میں بیٹھے ایک نے دوسرے سے کہا ——— "تتلی کہاں ہے؟"

"خاموش رہو" ددکر نے سرگوشی کی۔

دو راہ گیر بھی وہاں رک گئے۔

"کیا ہوا"

کیا ہوا؟

جواباً اچکتے شانے اور گہری خاموش چپ۔ گھوڑے نے پسلیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کی ساری پسلیاں پھڑپھڑائیں، ٹانگیں ہلیں، جسم ذرا سا اوپر اٹھا اور پھر دھپ سے نیچے جا گرا۔ اس کے ذہن کے خیمہ میں خون میں نہایا گھوڑا آن کھڑا ہوا۔ پیاسا میدان اور خون خون خیمے۔

خون، خون —— خون،

سرخ، گرم، ابلتا خون،

خون کا دائرہ پھیل کر سڑک کے بیچوں بیچ آگیا۔ ایک گزرتی کار چیختی بریکوں کے ساتھ فٹ پاتھ سے آلگی۔ "کیا ہوا"؟ کار والا بڑے نخرے نیچے اترا۔ گھوڑے کے قریب آکر اس نے ترحم سے اسے دیکھا اور بولا —— "Oh poor soul"

پھر کار کی طرف منہ کر کے بولا —— "گھوڑا مر رہا ہے"۔

"ہائی —— میں نے آج تک کسی گھوڑے کو مرتے نہیں دیکھا" کار میں سے نسوانی آواز آئی۔

کار والے نے سامنے کھڑے ایک شخص کو کندھے سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا اور بولا ——

"پلیز، ذرا ایک طرف ہو جائیے، بے بی گھوڑے کو دیکھنا چاہتی ہے"——

بے بی نے کار میں سے منہ نکال کر گھوڑے کو دیکھا۔ "What a Exciting scene"

"Oh poor soul" دوسری عورت نے جو عمر کی آدھی سے زیادہ سیڑھیاں پھلانگ چکی تھی اس کے شانوں سے جھانکا —— "What a scene"

گھوڑے نے پتلیاں پھیر پھیر کر ایک ایک کو دیکھا۔ اس کے نرخرے سے نکلتیں خرخر کی آوازیں قدرے اونچی ہو گئیں —— "تتلی" باغ میں بیٹھے ہوئے ساتھ والے نے کہا۔

"ہاں تتلی" ددکر نے سرگوشی کی۔

تتلی اوپر ہی اوپر منڈلانے لگی۔

ایک اسکوٹر والا کار سے ذرا پیچھے اسکوٹر روک کر فٹ پاتھ پر آگیا — "کیا ہوا ؟"
اس نے کار میں بیٹھی عورتوں کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری فٹ پاتھ کی سلیں خون پی کر ہونٹ چاٹنے لگیں۔ ان سب کو دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان کے ہٹنے سے فضا قدرے خالی ہوئی تو گھوڑے نے لمبا گہرا سانس لیا اور موت کی غنودگی کو سمیٹتا ہوا پوری آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھنے لگا۔ اس کی گردن دو تین لمحے تنی رہی، پھر نڈھال اور بے دم ہو کر زمین پر جا گری، اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی کمانوں کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئیں۔

تتلی نیچے اور نیچے اترنے لگی۔ دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دو اور راہ گیر ان میں شامل ہو گئے۔

"کیا ہوا ؟"

"کیا ہوا ؟"

گھوڑے نے ان کی آوازیں سن کر ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھولیں، پھر بند کر لیں اور موت کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ خون کا دائرہ گداں مارتا سڑک کے دوسرے کنارے کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ تتلی نے ایک ادھورا چکر کاٹا اور پھول پر آ بیٹھی۔ دونوں کے سانس زبانوں پر آ رکے، ہاتھوں میں پھڑپھڑاہٹ اور ڈوری پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

اس کی آنکھوں کی کربلا میں بھوکے پیاسے خیمے ابھر آئے، پیاسے خیموں سے گھوڑا باہر نکل اور اپنے سوار کو لے کر خون خون میدان میں قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

کار والے نے ناک سکیڑی — "یہ گھوڑے کے خون بو بھی عجیب ہے،" "NOT TOLERABLE"
اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کار میں بیٹھی عورتوں نے پرس کھول کر معطر رومال نکالے۔ خوشبو کے چھوٹے چھوٹے نقطے خون کی مہک کو گدگدانے لگے، اسکوٹر والے نے کار کی طرف دیکھتے ہوئے پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور وہ دو قدم پیچھے ہو گیا۔

خون کا دائرہ پھیل گیا — انہیں چند قدم اور پیچھے ہٹنا پڑا۔ دونوں نے بیک وقت ڈوری کھینچی — تتلی پھڑپھڑائی، اڑنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

گھوڑے نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا، اٹھنے کی آخری کوشش کی۔ اس بار اس نے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اٹھنا چاہا، مگر ذرا سا اٹھ کر دھپ سے نیچے جا گرا۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر تتلی کو پکڑا، احتیاط سے ڈبے میں بند کیا، جال سمیٹا اور چپ چاپ سڑک پر آگئے۔ اس کے ذہن میں ساحل سمندر سے لگا گھوڑا ابھر آیا جو سموں سے ساحل کی ریت کریدتا آگے اور آگے بڑھنے کے لئے مچل مچل گیا۔ آگے سمندر ——— گہرا نیلا سمندر ———

گھوڑا الوداعی ہچکیاں لینے لگا۔ کار والے نے کار کی طرف واپس جاتے ہوئے ترحم سے اس کی طرف دیکھا ——— " oh poor soul "

" گھوڑے کے خون کی بو خاصی ناگوار ہے"، اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ساتھ والیوں سے کہا ——— کار خون کے دائرے کو کاٹتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اسکوٹر والے نے کار کی طرف دیکھ کر پھر ہونٹوں پر زبان پھیری ——— اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور کار کے کاٹے ہوئے دائرے میں سے ہوتا ہوا کار کے پیچھے چلا گیا ——— گھوڑے کی آنکھیں بند ہو گئیں، پاؤں خاموش، صرف پسلیوں کا ارتعاش دھیمے سروں میں جاری رہا۔ راہ گیر ایک ایک کر کے اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے، سڑک پر پھیلا خون جم کر لوتھڑے کا چوغہ اوڑھنے لگا۔۔ سامنے والے کھمبے کا بلب بھی تھک کر دھندلا پڑ گیا۔ وہ گھوڑے کے پاس اکیلا رہ گیا۔

پیلے خیموں سے نکلتا خون میں ڈوبا گھوڑا، سموں سے ریت کریدتا گھوڑا ——— سب ایک ایک کر کے ذہن کے دھندلکوں میں گم ہونے لگے۔

گھوڑا خاموشی سے چپ چاپ مر رہا تھا، اس کا جسم ساکت اور آنکھیں بند تھیں۔ پسلیوں کا ہلکا سا ارتعاش جاتی زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا۔

سڑک دور دور تک سنسان ہو گئی۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور پاس پڑے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا ——— "کم از کم ایک آدمی تو ایسا ہو جو آخری سانس تک اس کے پاس رہے ———"

سہ پہر کی خنک (۲)

اُس نے لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

ب کے ہونٹوں پر عجیب پُراسرار مسکراہٹ نے آنکھ کھولی۔ "زندگی اک ست رنگا کبوتر، اس کے سارے رنگ کس نے دیکھے۔"

اس نے چٹکیوں سے چاندنی کو پکڑنے کی کوشش کی، بہتی چاندنی اس کی انگلیوں سے پھسل کر اِدھر اُدھر نِکل گئی۔

"ایک خواب۔ محض ایک خواب"

ب نے ہنکارا بھرا۔ "خواب مگر اکیلے کا نہیں۔"

وہ تیزی سے مُڑا۔ "دوسرا کون؟"

ب مسکرایا۔ "وہی جسے دکھانے کے لئے ہم سب کچھ کرتے ہیں؟"

"یہ تو ہے۔" وہ مسکرائی "تم باہر کیوں نہیں نکلتے؟"

"باہر نہیں تو کہاں ہوں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "باہر آنے کے انتظار میں۔"

"اور انتظار ایک کڑوا پھل ہے۔" ب نے اس کے کندھوں پر کھڑے ہوتے ہوئے اعلان کیا اور دیوار کے دوسری طرف کُود گیا۔

چاند گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اندھیرا باؤں کے نیچے چرمرا رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے توڑے گئے پھول کو پتی پتی کرنے لگا۔

وہ پتیوں پر پاؤں رکھتی ہوئی آئی ––– "ہائی۔"

"ایک گھنٹہ تین منٹ لیٹ۔"

اُس نے بے پرواہی سے شانے جھٹکے اور بولی۔ "شاپنگ کے لئے نکل گئی تھی۔"

اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ "میں
"مجھے معلوم تھا تم انتظار کر رہے ہو گے۔" وہ ہنسی "تم اور کر ہی کیا سکتے ہو؟"
"تم میری توہین کر رہی ہو۔"
"میں تو صرف دیر سے آنے کی وجہ بتا رہی ہوں۔"
"وجہ — خود کو محفوظ رکھنے کی ایک ڈھال — ہونہہ"
وہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور نرمی سے بولی۔ "تم لفظوں سے کھیلتے ہو۔"
"لفظ تو ٹوٹی ہوئی کمانیں ہیں۔" ب نے آہستگی سے اس کا کندھا دبایا۔ "اور ہم تو صرف تعمیل کرتے ہیں۔"
وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگتا ہے۔ سمٹتا ہی چلا جاتا ہے۔
اس کے سامنے کھڑی وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی، پھر لفظوں کو چبا چبا کر بولی
"بغیر مانگے کبھی کچھ نہیں ملتا۔"
اُس کی آنکھوں میں لہر سی اُچھلی، لیکن دوسرے لمحے ڈوب گئی۔ "میرے پاس مانگنے کے لفظ نہیں۔ کبھی
ب نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر مانگے ہی مل جاتا ہے، مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ طلب ایک تیز رفتار گاڑی ہے جو دوڑتی ہی رہتی ہے، کبھی نہیں ٹھہرتی۔"
اس نے کندھے جھٹکے — "لیکن میں دوسروں کی طرح اس گاڑی کے پیچھے نہیں دوڑ سکتا۔"
ب مسکرایا۔ "دوڑ تو تم اب بھی رہے ہو۔"
"نہیں میں بالکل الگ ہوں۔"
"ہم الگ ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے اندر ہی ہوتے ہیں۔"
وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "میں کسی کے اندر نہیں، اپنا چہرہ خود بنانا چاہتا ہوں۔"
ب ہنسا، دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا۔ "اپنا چہرہ ہم خود تو بنا سکتے ہیں، لیکن اسے شناخت دوسرے ہی کرتے ہیں۔ اپنی شناخت کے لئے ہمیں دوسروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔"
"نمبرہ" بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے عینکوں کے دھندلے شیشوں میں سے اسے گھورا۔
"ETE — 23704"

اکاؤنٹنٹ نے پے رول پر نشان لگایا اور تنخواہ کا ٹوکن اس کی طرف لڑھکا دیا۔ نوٹ گنتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لین دین کے پورے صفحے کو جلدی جلدی جمع تفریق کیا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لئے۔

" تو آج تمہیں تنخواہ ملی ہے" وہ مسکرائی

" ہاں اور میں بڑی مشکل سے بیس روپے بچا سکا ہوں"

" تم بے وقوفی کی حد تک صاف گو ہو" وہ آہستہ سے بولی۔ " اور یہ اچھی بات نہیں"

بیرا چائے لے آیا۔ اس دوران وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ بیرا چائے اور کباب رکھ کر چلا گیا تو وہ بولا "مجھ میں بہت سی اچھی باتیں نہیں ہیں"

" ہاں" اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ " تم ڈیڈی سے نہ ملنا انہیں ایسے لوگ ذرا اچھے نہیں لگتے"

کیبن کی چھت میں بڑا سا سوراخ ہو گیا اور تیز جلتا سورج عین اس کے سر پر ناچنے لگا۔

" اپنی شناخت کراؤ" ب نے سسکاری لی اور قریب سے گزرتی ایک عورت کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

عورت کچھ دور جا کر بس سٹاپ پر کھڑی ہو گئی اور مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

ب نے چٹخارہ بھرا۔ اور بولا " اس عورت نے اپنی شناخت دو منٹوں میں کرا دی ہے اور تم دو سال سے مل رہے ہو مگر ابھی تک یہ بھی نہیں جان سکے کہ وہ تمہیں سمجھتی کیا ہے ؟"

" تم مجھے کیا سمجھتی ہو ؟"

" میں ــــ میں تمہیں ــــ بس اچھا آدمی"

" صرف اچھا آدمی" اس کے چہرے پر گھنے سیاہ بادل چھا گئے۔

" نہیں میرا مطلب ہے"

" کیا ؟"

" یہی کہ تم اچھے آدمی ہو مگر ــــ"

" مگر کیا ؟"

وہ ہنسی۔ " یہ کہ تم ضرورت سے زیادہ اچھے اور ــــ"

"اور ایسے لوگ تمہارے ڈیڈی کو پسند نہیں۔"

"ہاں" اُس نے سر ہلایا۔

"اور تمہیں۔"

وہ کچھ دیر ناخن سے ناخن کھرچتی رہی پھر آہستہ آہستہ، بہت ہی آہستہ سے بولی۔ "میں بھی تو اسی دنیا میں رہتی ہوں۔"

گھنی سیاہ رات سارے جنگل میں پھیل گئی۔ گھپ گھپ اندھیرے میں وہ سر سے پاؤں تک بھیگ گیا بہت دیر بعد وہ جنگل سے باہر نکلا۔ "واقعی تم اسی دنیا میں رہتی ہو۔"

ب چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا ——" اس کے بعد ہم چپ چاپ اٹھے، خاموشی سے باہر آئے اور کچھ کہے بغیر اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔"

ب اب بھی چپ رہا۔

"میں کیا کروں؟"

ب کے ہونٹ اس کے چہرے میں دفن ہو گئے۔

"میں کیا کروں؟"

گہری الف خاموشی،

اس نے ب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا

ب کچی مٹی کے کھلونے کی طرح بھر کر زمین پر بکھر گیا۔

سنسان ویران سڑک پر دھند چپ چاپ قدم قدم چل رہی ہے۔

سلاخ دار کھڑکی کے پیچھے پتھر ہوتی آنکھوں سے، دور سے کسی کے آنے کی تمنا میں وہ دیر سے یونہی کھڑا ہے۔

ملازم آتا ہے اور کہتا ہے ——" بیگم صاحبہ کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"آ رہا ہوں۔" وہ جانے سے پہلے پھر ویران سنسان سڑک کو دیکھتا ہے۔

یہ سڑک کتنی ویران اور اداس ہے۔

اسے خیال آتا ہے کہ دس سال پہلے ہوٹل والے واقعہ کے دوسرے دن جب وہ اس کے ڈیڈی سے ملنے آیا تھا تو یہ سڑک ۔!

وہ سلاخوں میں سے باہر جھانکتا ہے ۔

سنسان ویران سڑک پر دھند اکیلی ہی قدم قدم، قدم قدم چل رہی ہے!

دھوپ میں سیاہ کیپ

اوپر غیر دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے بادل، نیچے شرماتی لجاتی شام، وہ ایک نظر بادلوں پر، دوسری شام پر ڈالتا ہے، لِنک اور زن سے گلی سے نکل کر سڑک پر آجاتا ہے، چوک میں اسے دائیں طرف مڑ کر ریستوراں میں جانا ہے، جہاں روز شام کو بیٹھتا ہے۔ دائیں طرف کی بتی سرخ ہے، وہ غیر ارادی طور پر بائیں مڑ جاتا ہے۔

ساری زندگی یوں ہی غیر ارادی طور پر نہ چاہے راستوں پر چلنے کی مجبوری، کئی بار باگ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی ہے، مگر ہاتھ بدل جاتے ہیں، باگ نہیں چھوٹتی، کئی ہاتھ، مختلف چھوٹے بڑے سخت نرم ہاتھ —— دائیں طرف مڑنے کی تمنا، مگر بائیں چلنے کی مجبوری —— بائیں چلنے کی خواہش، مگر دائیں مڑنے کی مجبوری، خواہش تو ہاتھ میں پھسلتی ریت،

اندھیرا اوباش لڑکوں کی طرح سیٹیاں بجاتا شرماتی شام کے پیچھے لگا ہوا ہے، شام چھجوں، سائبانوں اور کونوں میں سمٹ رہی ہے، وہ ان کے درمیان سے گزرتا، مرکزی شاہراہ پر آگیا ہے۔ دور دھندلاتے پہاڑ اشارے کرتے، نام لے لے پکارتے ہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے سپیڈ کم کر کے واپس مڑنے کے لئے پیچھے نظر ڈالتا ہے، مگر رکے بغیر آگے نکل جاتا ہے۔

گھوڑا دونوں ٹانگیں اٹھا کر ہنہناتا ہے، باگ توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے، مگر؟ زندگی کے راستوں پر کبھی ماں، کبھی باپ ٹریفک سپاہی کے روپ میں، سرخ بتی،

"میں" —— "میں"، لیکن ہمیشہ "وہ" —— "وہ"

تانگے میں جتا گھوڑا —— کوچوان ہنستا ہے، سواریاں کھکھلاتی ہیں،

غیر ارادی طور پر ایکسی لیٹر پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دروازے میں کھڑی اس کی بیٹی کہتی ہے —— "ابو! ایک شاپنر، ایک پنسل، ایک ربر —— "

بیٹی کے پیچھے کھڑی بیوی —— "جلدی آجانا"

موٹر سائیکل مرکزی شاہراہ پر اڑتی چلی جارہی ہے، بھورے پہاڑ رات کی گود میں چھپ گئے ہیں
ٹھنڈی ہوا اس کی گالوں پر چٹکیاں لیتی ہے وہ مڑنے کے لئے سپیڈ کم کرتا ہے، مگر بڑھا دیتا ہے۔
شہر اندھیرے کے تالاب میں ڈوبے کنکر کی طرح لہر کی صورت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا ہے
سردی اس کے انگ انگ میں انگڑائیاں لیتی ہے۔

"میں کہاں جارہا ہوں؟"

کھوئی آنکھوں کے سامنے پھیلی سڑک، واپس مڑنے کا ارادہ، موٹر سائیکل بھاگتی چلی جاتی ہے،
اوپر بادل ایک دوسرے کو بوسہ دیتے ہیں۔ بارش کی پھوار اس کے چہرے کو بھگو دیتی ہے آس پاس
کا سارا منظر اندھیرے کی بُکل میں ——

"میں کہاں جارہا ہوں؟"

"ابو ایک شاپنر، ایک پنسل، ایک ربر"

"جلدی آجانا"

دھندلائے چہرے، دھندلائی آوازیں،

سڑک کی ویرانی اس کے ساتھ ساتھ سمٹ رہی ہے، شہر دور —— بہت دور تالاب میں
ڈوبے کنکر کی طرح ——

موٹر سائیکل جھٹکے لیتا ہے، غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ ریزرو کو آن کر دیتا ہے۔

سامنے گیارہویں میل کا پتھر ——

گھر ابھی تک اس کی باہنوں کے دائرے میں —— مڑنے کی خواہش پھر اس کی آنکھوں
میں چمکتی ہے، مگر موٹر سائیکل رکے بغیر پھر رفتار پکڑ لیتا ہے،

بارھواں میل ——

تیرھواں ——

چودھواں ——

بارش کے موٹے موٹے قطرے —— سردی ماہر شکاری کی طرح اس پر جال پھینکتی ہے
پانی کوٹ، سویٹر اور قمیص سے رستا ہوا اس کے بدن پر ٹھنڈی انگلیاں پھیرتا ہے۔

جھر جھری ــــ

پندرھواں میل ــــ سولھواں، پھر سترھواں، اٹھارواں،

سر جھٹک کر، جھر جھری لے کر، خود کو سنبھالنے کی کوشش

ریزرو کی گنجائش اب ایک دو میل اور ــــ

ایک دو میل،

مایوسی کی ننھی چڑیا اس کے کندھے پہ پھدکتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب چڑھائی شروع ہو چکی ہے۔ مشین کی طرح اس کا پاؤں گیئر بدلتا ہے۔

گھر دور ــــ ایک موہوم نقطہ کی طرح،

"ابو، میرے لئے ایک شاپنر، ایک ــــ ایک"

"جلدی گھر آجانا ــــ جلدی، جلدی ــــ جلدی"

شفاف صاف آسمان پہ نیلی چڑیا اڑ رہی ہے، دفعتاً بلندیوں سے شکرا ــــ چونچ نکالتا ہے، پنجے پھیلا کر جھپٹتا ہے ــــ

بارش اس کے بدن پر دریاؤں کی طرح بہہ رہی ہے ــــ سردی ریڑھ کی ہڈی پر لمبی نکیلی چونچ مارتی ہے ــــ مارتی چلی جاتی ہے؛

دوسرا گیئر، موٹر سائیکل اب پہاڑ پر جانے والی سڑک پر دوڑے جا رہی ہے۔

شہر کی روشنیاں ــــ دور، جھلملاتی ــــ تیرتی، تیرتی۔

"میں کہاں جا رہا ہوں؟"

گھر ــــ سونے کا کمرہ، ہیٹر کے آگے دری پر اس کی بیٹی، بیوی، درمیان میں چلغوزوں کی ٹرے ــــ بیٹی ایک چلغوزہ چھیل کر اس کے منہ میں ڈالتی ہے اور گلے میں جھول جاتی ہے ــــ "ابو جی"

بیوی اس کے کندھے سے ٹیک لگائے چلغوزے چھیل رہی ہے،

ہیٹر کی تمازت ــــ لمس، گرم لمس، وجودوں کا، سانسوں کا۔

بارش تیز ہو گئی ہے

سردی ہاتھوں میں گینتی لئے اس کے جسم پر اس کی قبر کھود رہی ہے۔

اندھیرا گپ

"میں کہاں ——— ؟؟"

بارش کا پانی آنکھوں میں اتر رہا ہے:

منجمد ہاتھ ———

دفتر میں ہیٹر کے سامنے خوش گپیوں کی سرسراہٹیں، گرم چائے کا لمس،

موٹر سائیکل کی آواز اور رفتار میں کپکپاہٹ ——— ریزرو بھی ختم ہو رہا ہے۔

اوپر اندھیرا اور اندھیرے سے برستا منوں پانی ———

"ابو جی میرے لیئے ———"

"جلدی ———"

گھوڑا باگ تڑوانے کی کوشش میں دائیں بائیں سر مارتا ہے، سموں سے زمین کھریدتا ہے ———

اس کے وجود کی ڈائری سے لکھے ہوئے، کٹے ہوئے بے شمار ورق پھڑپھڑا کر نکلتے ہیں اور

اڑتے اڑتے، پرزہ پرزہ ہو جاتے ہیں۔

ایکسی لیٹر پر اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں،

واپسی، ایک خواہش جس کے پر ٹوٹے ہوئے ہیں،

موٹر سائیکل جھٹکے لیتا ہے ——— ریزرو بھی ختم ہو رہا ہے

وہ بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ——— سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل،

"ابو جی ———"

موٹر سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ بند ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ ہی ھیڈلائٹ کی روشنی بھی۔

گپ اندھیرا،

سردی نکیلی چونچوں سے اس کا سارا جسم ادھیڑ رہی ہے۔ موٹر سائیکل سے اترنے کی

کوشش میں لڑکھڑا جاتا ہے۔ موٹر سائیکل لڑھک کر سڑک کے درمیان جا گرتی ہے۔ وہ اٹھتا ہے،

سنبھلتا ہے، گر پڑتا ہے ـــــ درد کدال ہاتھ میں لئے اس کی قبر کھود رہی ہے ـــــ سردی بھوکے گدھ کی طرح اسے نوچ نوچ رہی ہے ـــــ

اندھیرا تیرہ تا اندھیرا ـــــ

شہر، روشنیاں، گھر ـــــ دھندلائی شبیہیں،

آنسو اور بارش کا پانی،

"ابو جی ـــــ"،

وہ بند ہوتی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔

"ابو میرے لئے ـــــ"،

"جلدی آ ـــــ جلدی ـــــ"

مسکراتے چہرے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہے ہیں،

آنکھوں کو کھلا رکھنے کی ناکام کوشش،

اندھیرا، بارش اور سردی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے گرد ناچ رہے ہیں،

دور نیچے ـــــ شہر کے ایک گھر میں ہیٹر کے سامنے چلغوزے چھیلتے ماں بیٹی سے کہتی ہے ـــــ "اب سو جاؤ میری جان" بیٹی جواب دیتی ہے ـــــ "ابو آئیں گے تو سوؤں گی ـــــ شاپنر، پنسل اور ربر ـــــ لائیں گے میرے لئے۔"

دور پرے ـــــ ویران سڑک پر گرا ہوا موٹر سائیکل، فاصلہ پر بارش میں بھیگتا، سردی کے پنجوں میں پھڑپھڑاتا ایک شخص ـــــ بند آنکھوں میں خواب، خوابوں میں آوازیں،

دھندلے خواب، دور ہوتی آوازیں،

"ابو جی ـــــ میرے لئے"،

"جلدی آجانا ـــــ آ ـــــ آ"

"ابو جی ـــــ ابو ـــــ اب"

بانجھ ریت
اور
شام
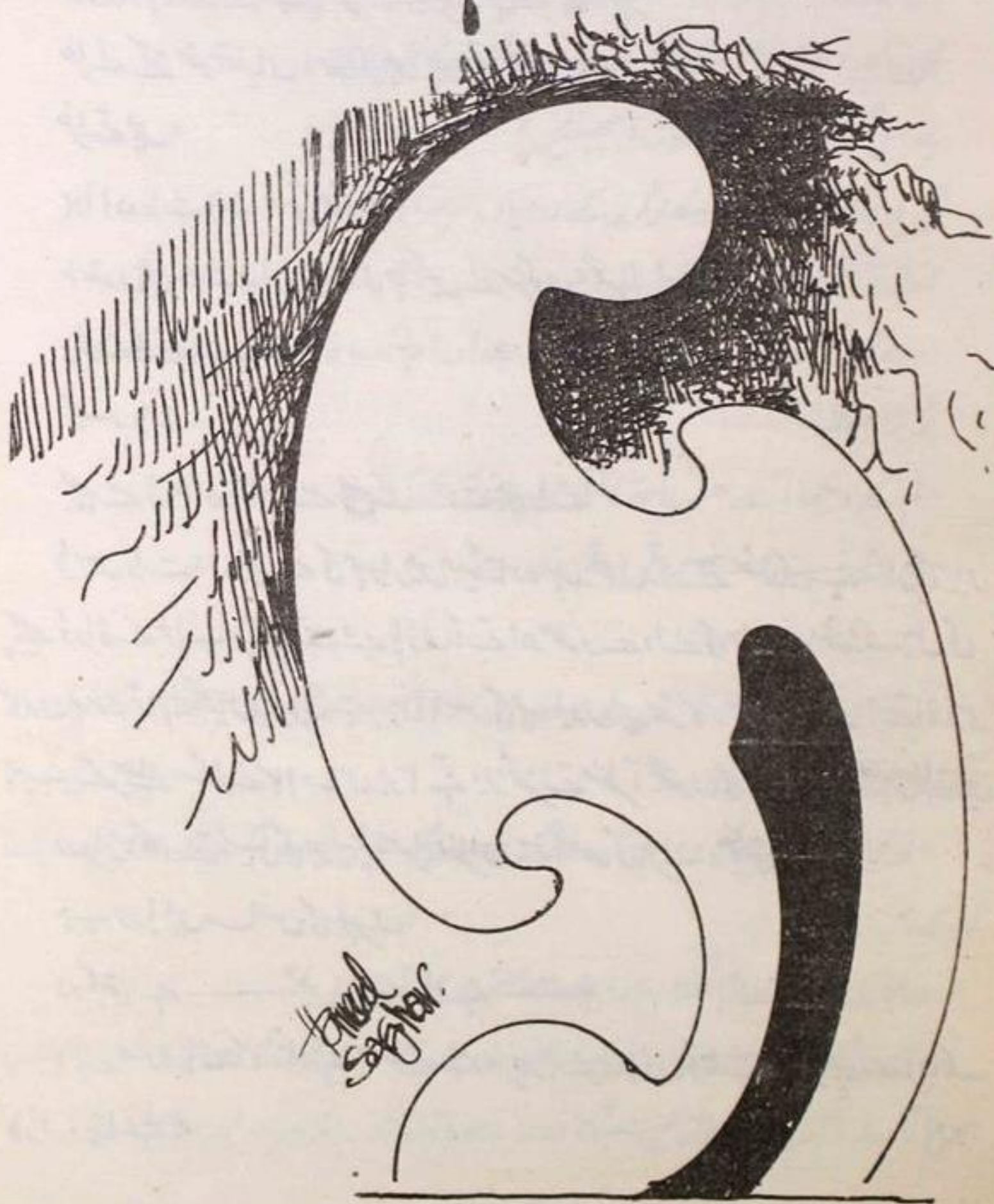
آسمان کا طشت اندھیرے سے لبالب بھرا ہوا ہے۔
اور الف ننگی رات ہاتھوں میں خوف کے چابک لئے گلیوں اور سڑکوں پر ناچ رہی ہے:
خار دار باڑوں اور بے بسی کے جبڑوں میں دبا ہوا شہر،
غراتے کتے تھوتھنیاں اٹھا کر ہوا میں سونگھتے ہیں،
غراتے ہیں،
ہوا اور رات الف ننگی ہو کر،
ہاتھوں میں دہشت اور خوف کی چابکیں لئے سڑکوں، گلیوں میں دوڑتی ہیں.
یہ خوف کی رات ہے،
مجسم رات،
صبح سے شام اور شام سے صبح تک رات ہی رات
اس رات، اندھیرے کی پھوار میں بھیگتا وہ چند لمحوں کے لئے ٹھٹھکتا ہے، تاریکی میں چھپے ڈراؤنے خواب، پیچھے سے دبے پاؤں آتے اور حملہ کرنے والے کی چاپ، ٹھنڈک اس کی گالوں پر نرم نرم انگلیاں پھیرتی ہے، ہوا اس کی پسلیوں میں ٹھوکا دیتی ہے، اُسے اپنے اندر کسی کینسر کے پھیلنے، سکڑنے کا احساس ہوتا ہے، لڑکھڑاتے منظر آنکھوں کی انگلیوں سے پھسل جاتے ہیں
دروازہ کھولتے اس کی بیوی پُراسرار نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے،
چپ دریا میں سانس کی لہریں،
وہ کہتی ہے —— "میں نے سنا ہے ——"
وہاں" وہ بات کاٹتا ہے "کوئی ہے ضرور جو دبے پاؤں آتا ہے اور پیچھے سے اچانک وار کر دیتا ہے"

"تم نے دیکھا اُسے" بیوی اس کی آنکھوں پر دستک دیتی ہے۔

"میں —— میں کیسے دیکھ سکتا ہوں، تمہیں کیسے خیال آیا؟"

"ویسے ہی —— ویسے ہی"

کچھ دیر بعد پھر وہی سوال —— وہی بات ——

"سنا ہے وہ دبے پاؤں آتا ہے اور اچانک پیچھے سے وار کر دیتا ہے۔"

"ہاں"

"وہ ایک اور شہر اتنا بڑا، آخر کوئی اسے پکڑتا کیوں نہیں، کچھ کہتا کیوں نہیں؟"

"کون کہے، ہر کوئی دوسرے سے اس کی توقع کرتا ہے"

بے معنی گفتگو، بھو کے لفظوں کی چھینٹیں،

گہری خاموشی سہمے ہوئے لوگوں کے درمیان سرسراتی ہے،

سوال آنکھیں ملتا سر اٹھاتا ہے،

"ہے کون جو دبے پاؤں پیچھے سے آتا ہے اور اچانک وار کر جاتا ہے۔"

بڑبڑاہٹ ——

"تم نے دیکھا اُسے" ساتھ والی میز سے آواز آتی ہے۔

"میں نے —— نہیں تو، تم نے ——"

میں نے بھی نہیں"

ٹی ہاؤس کی میز پر لفظ بکھرے ہوئے ہیں، وہ انہیں جوڑتا ہے، جھکے ہوئے سر اور جھک جاتے ہیں:

"تو کیا یہ مقدر ہے کہ وہ اچانک وار کرے اور ہم —— ایک ایک کر کے" ایک ایک کر کے۔"

وہ جانے والوں کے نام گنتا ہے، ہندسے ختم ہو جاتے ہیں؛

اندھیرا آسمان کے طشت میں بوند بوند جمع ہو رہا ہے، یہاں تک کہ آسمان کا طشت لبالب بھر جاتا ہے، تاریکی کی پھوار میں بھیگتا وہ سر سے پاؤں تک اندھیرے میں لتھڑ جاتا ہے۔

ڈراؤنے خواب کھکھلا کر ہنستے ہیں،

پیچھے آنے والا ناچتے شعلے کی طرح پھڑپھڑاتا، گلی کی نکڑ سے نمودار ہوتا ہے۔ اُسے اپنے اندر کسی شے کے پھیلنے، سمٹنے اور پھر پھیلنے کا احساس ہوتا ہے؛

لڑکھڑاتے ہوئے بہت سے منظر —— بہت سے منظر،

بہت سے منظر؛

وہ سر اٹھاتا ہے تو ناچتا شعلہ گزر چکا ہے،

آسمان کے طشت کے کناروں سے چاند منہ نکال کر اسے آنکھ مارتا ہے؛

بیوی دروازہ کھولتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرتی،

بیٹی کو گود میں اٹھاتا ہے تو ٹافیاں نہیں مانگتی۔

کھانے میں سے کچے گھی کی ہمک نہیں آتی،

دیواروں سے سیلن کی بو بھی نہیں،

بستر کی سختی چبھتی نہیں،

کوئی سوال نہیں —— کوئی جواب نہیں،

صبح دفتر جاتے ہوئے مسکراہٹیں، ٹاٹا کی چہکار،

دفتر میں میز پر کوئی PENDING فائل نہیں؛

مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں،

واپسی پر ٹی ہاؤس میں میز صاف ستھری، کوئی بکھرا ہوا لفظ نہیں،

گھر آتے ہوئے جب وہ گلی کی نکڑ پر پہنچتا ہے تو دائیں، بائیں پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کھکھلا کر ہنس پڑتا ہے،

بیوی مسکراہٹ کے چراغ جلائے دروازہ کھولتی ہے،

بیٹی دوڑ کر ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے،

اور سرمئی دھند کے دوسری طرف اسکی بیوی تعزیت کیلئے آنے والوں کو بتا رہی ہے کہ پرسوں رات گھر آتے ہوئے جب وہ گلی کی نکڑ پر پہنچا تو اچانک اس پر دل کا دورہ پڑا، اور —— اور ——

اور پھر وہ پھسک پھسک کر رونے لگتی ہے!
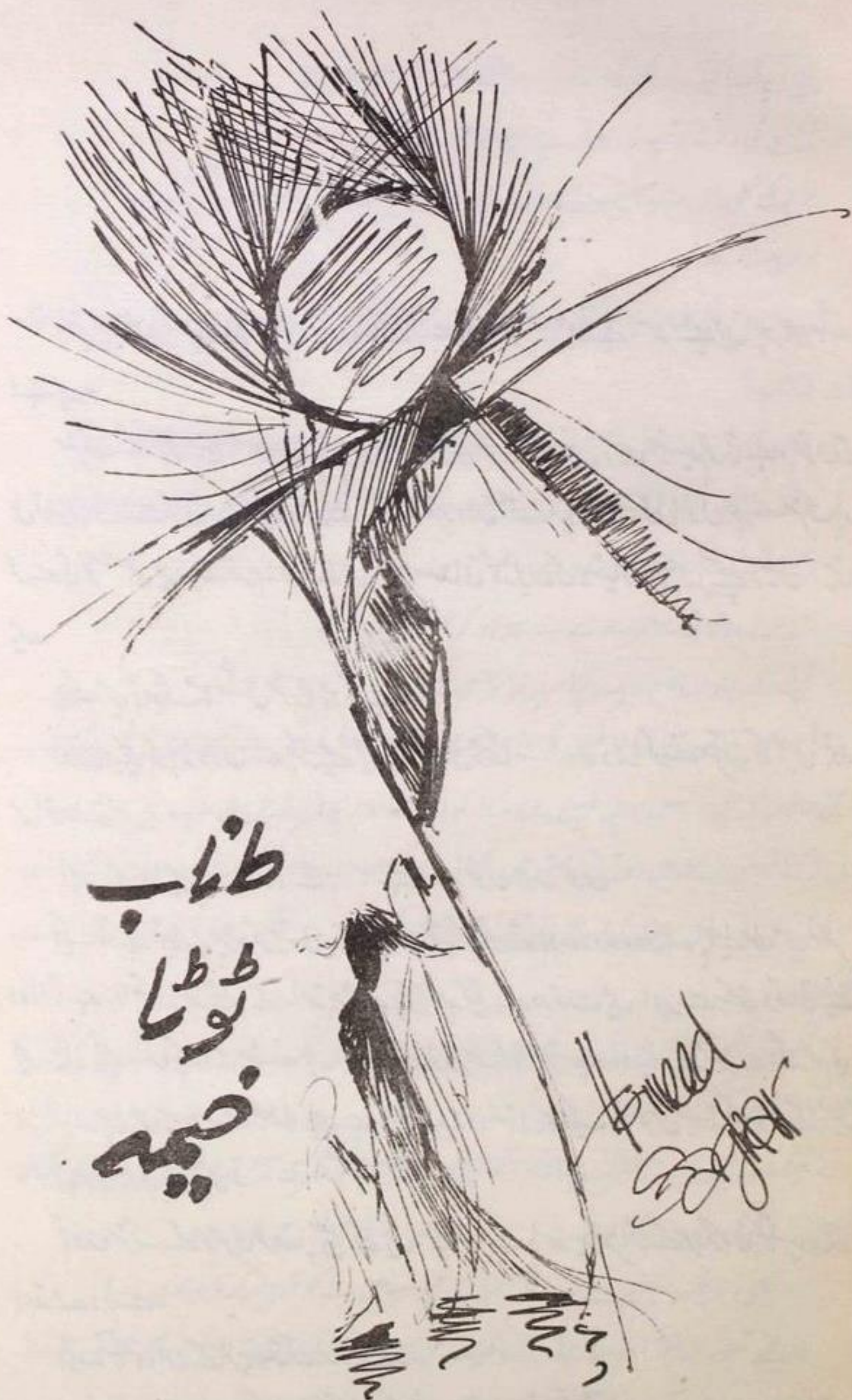
طناب
ٹوٹا
خیمہ

یہ شہر بہت پراسرار ہے یہاں لوگ جاگ رہے ہیں پھر بھی سو رہے ہیں، سو رہے ہیں پھر بھی جاگ رہے ہیں۔

سڑک کے بیچوں بیچ اس منڈیر پر جو اس چوڑی سڑک کو دائیں بائیں تقسیم کرتی ہے، پنجوں کے بل توازن درست کرتی — ایک عورت، ایک مرد، ان کے درمیان ایک گول مٹول بچہ — سڑک پار کرنے کی کوشش میں ایک قدم اٹھاتے ہیں لیکن سنناتی گاڑیوں کی سیٹیاں انہیں پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔

چوک میں ٹریفک کا سگنل سرخ ہوتا ہے۔

دونوں بچے کو بازوؤں سے پکڑ لیتے ہیں اور ڈولی ڈنڈا — ڈولی ڈنڈا کرتے سڑک کی پھیلی باہوں میں اتر جاتے ہیں۔

بچہ بازوؤں میں جھولتے ہوئے ہنستا ہے — غوں غوں غوں۔

ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر پھولی سانسوں کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ دور تک پھیلے خلا میں نظر دوڑاتا ہے۔ دائیں ہاتھ ٹیلے کے ساتھ جڑے پانچ چھ کیکر کے درخت ہیں۔ اوپر سے یہ کئی دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے جا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ زمین دُور دُور تک کٹی پھٹی ہے۔ اونچے نیچے ٹکڑے، گندم کی سبز بالیاں جن میں پیلاہٹ جھلملا رہی ہے۔ بائیں طرف درختوں کا ایک خاموش جھنڈ کھیتوں کے درمیان خاموش سوئی ہوئی پگڈنڈی۔

تینوں سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئے ہیں۔ بچے کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر کے مرد گزرتی ٹیکسیوں کو ہاتھ دے رہا ہے۔

ایک ٹیکسی ان کے قریب رُک جاتی ہے۔

وہ بچے کو بازوؤں میں جھلاتے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

بچہ اُچک اُچک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ٹیکسی کی رفتار تیز ہوتی ہے پھر کم ہونے لگتی ہے۔

برابر کی گلی میں سے بھینسوں کا ایک قافلہ نکلتا ہے اور سڑک عبور کرنے لگتا ہے۔

مرد ہنستا ہے۔

عورت اس کی طرف دیکھتی ہے تو کہتا ہے۔ "اس سڑک پر چھٹی اور بیسویں صدی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔"

ٹیکسی بھینسوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش میں ایک اور گاڑی سے رگڑ کھاتی ہے۔

دونوں ڈرائیور نیچے اتر آتے ہیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے کے لیئے زور زور سے بولتے ہیں۔

پیچھے دُور تک ٹریفک رُکی ہوئی ہے

بھینسوں والا بڑے مزے سے ــــ ہو ہو کرتا چلا جا رہا ہے۔

ٹیلے کے چاروں طرف ایک پُراسرار خاموشی ہے۔

اِکا دُکا درختوں کے ساتھ چلتی پگڈنڈی ڈھلوان کی طرف مڑنے لگتی ہے اُس سے آگے گہری کھائی ہے اتنے سالوں میں بھی اُس پر پل نہیں بن سکا۔ کھائی کے دوسری طرف جرنیلی سڑک ہے جس پر سارا دن ٹرک، بسیں اور کاریں دوڑتی رہتی ہیں۔ کھائی سے اِس طرف خاموش کھیت ہیں، جہاں رات پھسلتی ہوئی آتی ہے اور پاؤں پسار کر لیٹ جاتی ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی سورج گمر کے آنگنوں میں جھاتیاں مارنے لگتا ہے۔

گُکو ــ گُکو، کی آواز وقفوں وقفوں سے چاروں طرف گونجتی ہے۔ ایک ہی لے ــــ ایک ہی سُر میں۔

ٹیکسی ایک چھوٹی سڑک پر دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں گھری قدم قدم چل رہی ہے بچہ اُچھل اُچھل کر کھڑکی کی طرف لپکتا ہے۔

"دیکھو، دیکھو شیشے سے سر نہ ٹکرا جائے۔" مرد عورت کو خبردار کرتا ہے،

اُونچے ٹیلے پر بیٹھا وہ سامنے والے کھیت میں کام کرتی ایک عورت اور اس کے بچے کو دیکھ رہا ہے۔ عورت چھولئے کے پکے پودے توڑ رہی ہے اور بچہ انہیں گڈیوں میں باندھ رہا ہے۔

سورج کی کرنوں میں جوانی کا گرم خون دوڑنے لگا ہے، وہ جسموں میں چٹکیاں لینے لگی ہیں۔

پسینے میں ڈوبی ہوئی عورت اور بچہ۔

چھولئے، مسور اور گیہوں کی مسحور کن خوشبو

اور مسلسل — ٹکو — ٹکو،

ٹیکسی آگے پیچھے کے رش میں اب تقریباً رُک گئی ہے۔

بچہ شیشے میں سے جھانکتے ہوئے مسلسل، غوں غوں — غوں غوں کر رہا ہے۔

عورت کہتی ہے — "جان دیکھو مُنا باتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

بچہ یہ سن کر — "اُکاں — کناں — کاں" کرتا ہے۔

"دیکھا — دیکھا" عورت خوشی سے پھولے نہیں سماتی

مرد مُسکراتا ہے — ایک گہری پُر اسرار مسکراہٹ

"بس بولنے کا چاؤ ہی ہوتا ہے" وہ مسکراتا رہتا ہے — "ہم بول سکتے ہیں مگر کیا واقعی بول سکتے ہیں؟"

بچہ اس بات سے بے نیاز، شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے — غوں غاں، آکناں — کاں کا" کرتا رہتا ہے۔

آگے ایک ٹانگے والا بدکے ہوئے گھوڑے کو رام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پیچھے مسلسل پُوں پُوں میں پردتی ہوئی لمبی گاڑیوں کی قطار۔

ایک موٹر سائیکل ٹیکسی کے برابر آکر رکتی ہے۔ موٹر سائیکل پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے جین کی جیکٹ اور پتلون پہنی ہوئی ہے۔ لڑکی نے پتلون نما پائجامہ،

سٹرنگوں کے پیچھے بیٹھے سارے مرد اُسے دیکھتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور مزے سے ہارن بجاتے رہتے ہیں۔

سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر دو عورتیں سفید ٹوپی دار برقعہ پہنے سڑک پار کرنے کی جستجو میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتی ہیں انکے لمبے خیمہ نما برقعے ان کیلئے مصیبت بنے ہوئے ہیں اور بار بار اُن کے پاؤں میں الجھتے ہیں۔

ٹیلہ پر بیٹھا وہ خاموش چُپ نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے، عورت اور بچے نے جھولے کی گڈیاں سروں پر رکھ لی ہیں اور مزے مزے پگڈنڈی پر چلے جا رہے ہیں۔

گھوڑا تانگے والے کی مسلسل کوششوں کے باوجود نہیں مان رہا۔ سٹیرنگ کے پیچھے بیٹھے سارے پوں پوں کر رہے ہیں برابر کی سڑک میں سے ایک بیل گاڑی نکل کر ٹیکسی کے دوسری طرف آن کھڑی ہوتی ہے۔

بچہ شیشوں میں سے جھانکتے ——— "کاں —— کاں کاں" کر رہا ہے۔

بدکا ہوا گھوڑا

اس کے پیچھے گاڑیوں، بیل گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کی قطاریں رفتہ رفتہ ساکت ہوتی چلی جاتی ہیں

ایک پُراسرار شور

شور ہی شور

دفعتاً ٹیکسی ڈرائیور کو احساس ہوتا ہے کہ پچھلی سیٹ پر گہری خاموشی ہے۔

وہ تیزی سے مڑتا ہے۔

پچھلی سیٹ خالی ہے۔

وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور اس کی نظر دکانوں پر لگے سائن بورڈوں پر جا ٹکتی ہے

عورت چائے کے ایک اشتہار پر چپکی ہوئی ہے۔

مرد سگریٹ کے ایک اشتہار پر کھڑا ہے۔

اور بچہ ——— دودھ کے ایک اشتہار پر گلاس ہاتھ میں لئے کچھ کہہ رہا ہے۔

یہ شہر بہت پُراسرار ہے یہاں لوگ جاگ رہے ہیں، پھر بھی سو رہے ہیں، سو رہے ہیں پھر بھی جاگ رہے ہیں۔

پیلا شہر سراب

بڑی غیر متوقع اور عجیب رات ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے کی بُکل میں لپیٹ لیا ہے۔

آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں نے شب خون مارا ہے —!

بادلوں کے آگے آگے دوڑتے ستارے جان بچانے کی کوشش میں دور گہرائیوں میں ڈوب گئے ہیں۔

بڑی سڑک پر دکانیں بند ہو رہی ہیں۔

شٹروں کے گرنے، شوکیس کے کھنچنے کی اِکا دُکا آوازوں کے درمیان، ہوا کی سرسراہٹ کا مسلسل احساس اور ایک عجیب بے یقینی کی کیفیت میں ڈوبا تیز تیز چلتا وہ، تعاقب کرتی آہٹ کا ایک ہی ردم

دو شخص اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔

ہوائیں سرسراہٹ، بوند بوند گرتی بے یقینی۔

اس کے قدموں میں تیزی آ جاتی ہے۔

تعاقب کرتی آہٹ کا ردم وہی،

وہ دونوں اس کی رفتار کا برابر ساتھ دے رہے ہیں —!

"تعاقب" خوف پہلو سے بل کھاتا نکل جاتا ہے۔

وہ تیز ہو جاتا اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔

وہ بھی تیز ہو جاتے ہیں۔

سامنے چوک۔ سمت کا انتخاب۔

پیدل کراسنگ کی بتی سرخ ہے، لیکن وہ ٹریفک کی پروا کیے بغیر دوڑ پڑتا ہے اور گاڑیوں سے بچتا

بچاتا ہانپتا کانپتا دوسری طرف نکل جاتا ہے۔

پیچھے آتے وہ دونوں سڑک کے درمیان پہنچ چکے ہیں۔

"تو تعاقب"____ وہ دوڑ پڑتا ہے ____ دوڑتا رہتا ہے۔

دکانیں کب کی بند ہو چکی ہیں، لوگ گھروں کو جا چکے ہیں اور وہ اس تنہا اکیلی سڑک پر، ہانپتی ہوا کے ساتھ قدم قدم چل رہا ہے۔

وہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟

"کیوں؟"

فضا میں شعلہ لپکتا ہے، ہوا بجلی کے تاروں کو جھولے کی رسی کی طرح گھما رہی ہے۔

تار سے تار ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور پھر گھور اندھیرا ____

اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آگریں؟

وہ جست لگا کر سڑک کے بیچوں بیچ آجاتا ہے۔

یہ انتہائی تاریک رات ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے اندھیرے نے روشنی کی ایک ایک کرن کو چُن چُن کر نگل لیا۔

وہ سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا ہے۔

اُڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے، اُسے خیال آتا ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آجائے تو۔

تو ____

وہ سمٹ کر دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر آجاتا ہے۔

ہوا تیز ہاتھوں سے سائن بورڈوں کو ڈھول کی طرح بجا رہی ہے۔

اس کے سر پر سائن بورڈوں کی قطار ہے۔

ہوا چنگھاڑتی ہے، خوف کا کتا اس کے گرد چکر لگاتا، بھوں بھوں کر رہا ہے۔

اگر کوئی سائن بورڈ مجھ پر آن گرے تو ____

تو ____

وہ اچھل کر سڑک کے بیچوں بیچ آجاتا ہے۔

یہ بڑی ڈراؤنی سرد رات ہے۔

کھمبوں پر لگے ہوئے بلب تھک کر پیلے پڑ گئے ہیں اور ٹمٹماتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہے ہیں

وہ رُک جاتا ہے، جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے اور سڑک پر تقریباً اوندھا ہو کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتا ہے، مگر ہوا ہاتھوں میں تیر کمان لیے نشانے لگا رہی ہے۔

وہ سڑک کے درمیان بیٹھ جاتا ہے اور گھٹنوں میں سر دے کر ماچس جلاتا ہے۔ دفعتاً اسے خیال آتا ہے اگر ایسے میں کوئی گاڑی اُس کے اُوپر سے گزر گئی تو ——

تو ——

وہ اتنی تیزی سے اُچھلتا ہے کہ سگریٹ منہ سے نکل کر دور جا گرتی ہے۔

یہ رات ٹوٹ ٹوٹ کر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔

گہرا گاڑھا اندھیرا تارکول کی طرح چیزوں کے منہ پر بہہ رہا ہے۔

ایک طرف کی فٹ پاتھ پر بجلی کی تاریں اور تیز طوفانی ہوا۔

دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر سائن بورڈ اور ہانپتی کانپتی پاگل ہوا۔

سڑک کے بیچوں بیچ شاں شاں کرتی تیز گاڑیاں

"گھر ——"

کہیں دور تاریکی میں ڈوبا ہوا گھر عکس کی طرح ہلتا جھلملاتا ہے۔

تیز ہوا، ڈراؤنی شکلیں بناتے بادل

نہ ختم ہونے والی ہیبت ناک رات اُس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

چیزیں اندھیرا

آواز اندھیرا

پہچان اندھیرا

رنگ اندھیرا —— اندھیرا ہی اندھیرا

وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا کبھی مُڑ کر دیکھتا ہے کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کبھی ایک طرف کی فٹ پاتھ پر نظر ڈالتا ہے جس کے اُوپر بجلی کی تاریں ہوا کے زور سے پھڑپھڑا رہی ہیں۔ ان کے ٹکرانے سے بجلی کا شعلہ

لحظہ بھر کے لئے اندھیرے میں چمکتا ہے۔ پھر تیز رگڑ اور موت کی سیٹی کا مسلسل شور۔ دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر بڑے بڑے سائن بورڈ ہل ہل کر اپنی میخوں میں ڈھیلے ہو کر جھول رہے ہیں۔

سر پر گہرے گھنے اُمڈتے بادل اور دل ہلانے والی گڑگڑاہٹ۔

سڑک کے بیچوں بیچ تیز گاڑیوں کے نیچے آ کر کچلے جانے کا خوف۔ آگے گھور اندھیرا جس میں ڈوبے ہوئے گھر کا تصور —— ایک خواب محض ایک خواب۔

اس خواب کے پیچھے قدم قدم چلتا وہ کبھی رُک جاتا ہے، چل پڑتا ہے پھر رُک جاتا ہے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھتا ہے پھر چل پڑتا ہے۔

بادل پورا زور لگا کر چیختے ہیں اور بارش کا ایک بھرپور تھپیڑا اس کے منہ پر آ کر لگتا ہے۔ کھمبے کے اوپر زوردار دھماکہ ہوتا ہے۔ شعلہ چمکتا ہے تو سڑک دور دور تک روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے بتاشے کی طرح اندھیرے میں بیٹھ جاتی ہے ایک سائن بورڈ چرچراتا ہے اور دھماکے سے نیچے آن گرتا ہے۔

وہ کبھی دائیں، کبھی بائیں اور کبھی درمیان ہونے کی کوشش میں سر سے پاؤں تک بھیگ جاتا ہے۔

عمریں بیت جاتی ہیں۔

برف سرا در برف بھنوؤں کے ساتھ گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے لگتا ہے، جیسے ٹھنڈک اس کے بدن پر ننگی ننگی انگلیاں پھیر رہی ہے۔

دروازہ کھلتا ہے اس کی بیوی لپک کر کہتی ہے۔ "شکر ہے آپ"

پھر فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے —— "کون ہیں آپ؟"

"میں —— میں" وہ تتلا کر رہ جاتا ہے۔

اندر سے اس کی بیٹی کی آواز آتی ہے —— "امی کون ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے؟" اس کی بیوی خوفزدہ سی آواز میں کہتی ہے اور جلدی سے دروازہ بند کر لیتی ہے۔

یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب رات ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے کی بُکل میں لپیٹ لیا ہے۔

یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب ——!

دھند ریت

ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پر مڑی تو اسے برسوں پہلے کی وہ رات یاد آگئی، جب وہ ائرپورٹ آیا تھا۔ باہر جانے کے تجسس کے ساتھ ساتھ شہر چھوڑنے کا دکھ بھی اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ وہ شہر سے بہت پیار کرتا تھا۔ لیکن اس کی خالی جیبیں اور ضرورتوں کے بھیانک عفریت اسے دھکیل کر ائرپورٹ لے آئے، جہاز میں بیٹھنے تک وہ مڑ مڑ کر دور دھند کے میں گم شہر کو دیکھتا رہا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے شہر کی سیمیں کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہے وہ سیڑھیوں کے درمیان رک گیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگا، شہر کی سرمئی کلائی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی، شہر کی کچی، سوندھی خوشبو دور دور ہوتی گئی۔

اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور امڈتے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کرنے لگا۔ ٹیکسی لمبی سڑک پر بھاگتی چلی جا رہی تھی، راستے کی ملی جلی روشنیاں آنکھیں مارتیں اسے گدگدا رہی تھیں۔

وہ برسوں بعد واپس آیا تھا۔

یہ طویل برس اس نے مشقتوں کے پہاڑ چڑھتے گزارے تھے، نئے شہر کی رنگ برنگی روشنیوں میں اسے کئی بار اپنا شہر یاد آیا، پھر دھیرے دھیرے وہ آس پاس کے شور کا عادی ہوتا گیا۔

ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی، سڑک کے کنارے بھاگتے کھمبوں کی روشنی دھندلاہٹوں میں تیر رہی تھی۔ ان طویل برسوں میں اپنے شہر سے اس کا رابطہ دوستوں عزیزوں کے خطوں یا اخباروں کے تبصروں اور خبروں تک محدود رہا تھا۔

ٹیکسی کے شیشوں سے سڑک کی ڈھلوانوں پر اُگے گھنے درختوں کو دیکھ کر اسے مٹیالی دیواروں والا ہوٹل یاد آگیا۔

سرِشام وہ اس ہوٹل میں جمع ہوتے اور ادھڑے چہرے والی میز کے گرد بیٹھ کر اپنی اپنی جھنجلاہٹیں

کھرچتے اور تھکے قدموں گھر لوٹ جاتے۔

"وہ مٹیالے نام والا ہوٹل تو وہیں ہے نا"

ڈرائیور نے مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——— "کونسا ہوٹل"؟

"وہ" ——— وہ چپ ہو گیا ——— "کچھ نہیں"

ڈرائیور نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ٹیکسی پل سے گزر رہی تھی۔

وہ اس ٹوٹے پل سے کئی بار گزرا تھا۔ اس رات بھی جب وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا ٹیکسی پل کی ناہموار سطح سے اچھل اچھل پڑی تھی۔ وہ ڈر سا گیا تھا کہ کہیں ٹیکسی اچھل کر ندی میں نہ جا گرے۔

وہ سنبھل گیا۔

ٹیکسی خاموشی سے گزر گئی۔

"تو پل بن گیا ہے"

"کیا"

"کچھ نہیں ——— کچھ نہیں"

ڈرائیور نے شانے جھٹکے اور چپ چاپ ونڈ سکرین میں دیکھنے لگا۔

ٹیکسی شہر جانے والی لمبی سڑک پر دوڑے جا رہی تھی۔

"سڑک اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا، اور مشکوک آنکھوں سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"یہ مجھے کہیں اور تو نہیں لے جا رہا"

راستہ سنسان اور طویل

شہر کتنی دور ہے؟

دھندلاتی روشنیاں گہری تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور سڑک کے آس پاس کا منظر پہچان کھو رہا تھا۔

ٹیکسی اندھیرے میں رک گئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"شہر آگیا"۔

"شہر —— کہاں ہے شہر؟"

ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا —— دیکھتا رہا، پھر بولا —— "یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے؟"

اس نے شیشوں سے باہر جھانکا۔

دھند —— دھند، دھند

ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

اس نے سوچا اترنے سے انکار کر دے۔ ڈرائیور شاید اس ویرانے میں اسے لوٹنے کا ارادہ کر رہا ہے، لیکن پھر سوچا اندر بیٹھنے سے بھی کیا۔

وہ بھی باہر آگیا۔

"کہاں ہے شہر؟"

"یہ اور کہاں؟"

"کہاں"

ڈرائیور ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا —— "تم پاگل تو نہیں"

"پاگل —— پاگل تو تم ہو"

"بابا میری جان چھوڑو —— چودہ روپے بنے ہیں"

"لیکن شہر"

"کونسا شہر —— یہ شہر نہیں تو اور کیا ہے؟"

"ک —— کہاں؟"

"یہ بازار —— دکانیں اور روشنیاں، یہ کیا ہے؟"

"کونسا بازار —— کہاں ہیں دکانیں؟"

"اوہ خدایا کس پاگل سے واسطہ پڑ گیا ہے؟" ڈرائیور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا —— "بھائی مجھے چودہ روپے دے دو میری جان چھوڑو"

"لیکن شہر"

"شہر، شہر ــــ یہ شہر نہیں تو کیا میرا سر ہے؟"

"کہاں ــــ ؟" وہ چیخ اٹھا ــــ "مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے، کہاں ہے شہر؟"

"جہنم میں" ڈرائیور غصہ سے بولا ــــ "میرے چودہ روپے دو"

"میں نہیں دوں گا، پہلے مجھے شہر لے کر چلو"

ڈرائیور دو تین لمحے چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا، پھر گھوم کر اسی کے سامنے آگیا" اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا. پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا.

"کیا کر رہے ہو؟" وہ غصہ سے بولا.

"دیکھ رہا ہوں تم اندھے تو نہیں"

"اندھا میں ــــ اندھے تم ہو" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا.

ڈرائیور کی نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں. اس کے آگے بڑھنے سے وہ ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تو اس کی نظریں اس کے پاؤں پر پڑیں۔

وہ چونک پڑا.

دو تین لمحے سکوت، پھر وہ بولا ــــ "تم زمین پر تو کھڑے ہی نہیں، تمہیں شہر کیسے دکھائی دے؟"

"کیا؟" اس نے بوکھلا کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا ــــ "اگر میں زمین پر نہیں کھڑا تو کیا ہوا میں ہوں؟"

"اور کیا"

"کیا بکواس کرتے ہو؟ مجھے شہر لے کر چلو"

ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑ لیا اور زمین کی طرف دباتے ہوئے بولا ــــ

"ابھی تمہیں شہر نظر آتا ہے"

"یہ کیا کر رہے ہو ــــ نیچے گرا کر میرا بٹوہ نکالنا چاہتے ہو"

اگلے لمحے وہ ڈرائیور سے گتھم گتھا ہو گیا۔

(۲)

جب وہ ائرپورٹ کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو دوسری ٹیکسیاں سواریاں لے کر نکل رہی تھیں؛ جہاز آئے دیر ہو چکی تھی۔

بے دلی سے سگریٹ سلگا کر، وہ مرجھائی نظروں سے بڑے گیٹ کو دیکھنے لگا: بڑا گیٹ سنسانی کی سیٹیاں بجا رہا تھا۔

اس کا جی چاہا کبھی وہ بھی اس گیٹ سے نکلے، ہاتھوں میں چمڑے کے سوٹ کیس، چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس۔

وہ رعب سے آواز دے ——— "ٹیکسی"

"ٹیکسی"

"جی صاحب"

گاڑی شہر جانے والی لمبی سڑک پر رواں ہوئی تو اس نے کن انکھیوں سے سواری کا جائزہ لیا، پشت سے ٹیک لگائے یہ شخص تیزی سے دوڑتے منظروں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا:

اس نے سوچا، یہ لوگ ضرورتوں کی منہ زور چڑیلوں سے بھاگ کر شہر چھوڑ جاتے ہیں، باہر جا کر محنت کی چکیوں میں پستے ہیں اور پھر جب واپس آتے ہیں تو ان کے بٹوے پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

"بزدل"

"کیا"

"کچھ نہیں" وہ سنبھل گیا۔

ایک گہری چپ

اس جہاز سے آنے والی سواریاں عموماً منہ مانگا کرایہ دیا کرتی ہیں، اسی لئے وہ اس وقت ائرپورٹ آجاتا ہے اور دن بھر کی جھنجھٹ ایک ہی پھیرے میں دور ہو جاتی ہے، لیکن آج معاملہ قدرے مشکوک محسوس ہو رہا ہے،

یہ شخص،

ڈکی میں چمڑے کے دو سوٹ کیس،
چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس،
ایک دن وہ بھی ان سوٹ کیسوں کے ساتھ آئے گا —— ابھی تو وہ صرف ٹیکسی چلا رہا ہے:

بی۔ اے کرنے کے بعد بھی ٹیکسی
دفتروں کی خاک چھان چھان کر، کورا روکھا جواب سن سن کر آخر یہ ٹیکسی
خواب، خواب —— خواب
سوٹ کیس —— چیزوں سے، کپڑوں سے، ڈالروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس،
آج کام کچھ پھیکا ہے۔
"کوئی بات نہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا —— "میں جھگڑا نہیں کروں گا۔"
ٹیکسی شہر کی حدود میں داخل ہو گئی۔
اس نے کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لیا —— "یہ شخص ٹھیک نہیں، پر میں کرائے کا جھگڑا کروں گا ہی نہیں۔"
ٹیکسی شہر کے بیچوں بیچ آگئی۔
ایک گہری اداس، نم آلود چپ،
اس نے فٹ پاتھ کے ساتھ ٹیکسی روک دی،
پھر بھی ایک اداس، غم ناک، بھیگی بھیگی ٹھنڈی چپ
"شہر آگیا"
"شہر —— کہاں؟"
"کیا کہاں؟"
"شہر"
"شہر —— یہ شہر ہی تو ہے" وہ نیچے اترتے ہوئے بولا،
پیچھے بیٹھا ہوا وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر وہ بھی نیچے اتر آیا —— "کہاں ہے شہر؟"

"یہ اور کہاں ؟"

"کیا یہ شخص کرایہ نہ دینے کے لئے، یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس نے جھک کر میٹر دیکھا، چودہ روپے بنے تھے،

یہ بازار، دکانیں، روشنیاں ——— اُسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا؟

اسے یقین ہو گیا کہ اس شخص سے کرایہ بھی وصول نہیں ہوگا، آخری کوشش کے طور پر اس نے پھر کرائے کا مطالبہ کیا تو اس کی وہی رٹ ——— "مجھے شہر لے کر چلو"

وہ گھوم کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا، اور غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

یہ کیا ——— یہ شخص تو زمین پر کھڑا ہی نہیں

تو کیا شہر اسی لئے اسے نظر نہیں آرہا؛

اسے تو آگ ہی لگ گئی ——— تم زمین پر تو کھڑے ہی نہیں، تمہیں شہر کس طرح نظر آئے؛

"کیا ——— کہا" وہ بوکھلا گیا ——— "میں زمین پر نہیں تو کیا ہوا میں کھڑا ہوں"

"ہاں ——— ہوا ہی میں کھڑے ہو" وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا ——— "بالکل ہوا میں کھڑے ہو"

دوسرے شخص نے ایک لمحہ تک سٹ پٹاہٹ کے بھنور میں غوطہ کھایا، پھر فوراً سنبھل کر غصہ سے بولا ——— بکواس کرتے ہو، مجھے لوٹنا چاہتے ہو"

"کیا ——— کیا"

اگلے لمحے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

(۳)

وہ اندر داخل ہوا تو اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی آئی ——— "ابو میری ٹافیاں"

وہ جیب سے دو ٹافیاں نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔

"ابو ——— بیچ"

"بیٹے بس"

اس کی بیٹی دونوں ٹافیاں ایک ساتھ منہ میں ڈال کر ننھے ہاتھ پھیلاتی ہے ——

"ابو —— اور"

وہ بے بسی سے بیٹی کے خالی ہاتھوں کو دیکھتا ہے —— "میں جب باہر جاؤں گا نا تو اپنی بیٹی کے لئے ڈھیر ساری ولایتی ٹافیاں لاؤں گا —— ہے نا"

پھر جیب سے دن بھر کی ریزگاری نکال کر بیوی کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے، دھیمے، سست لہجہ میں کہتا ہے —— آج ائرپورٹ سے خالی ہی آنا پڑا ہے"

بیوی پیسے گننے لگتی ہے، لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہتا ہے"

"کیا بات ہے ؟" بیوی سر اٹھا کر تشویش سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔

وہ ہچکچاتا ہے، پھر رکتے رکتے کہتا ہے —— میں زمین پر ہی کھڑا ہوں نا"

"کیا مطلب ؟" بیوی حیرت سے کہتی ہے

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں" وہ تیزی سے والے کمرے میں چلا جاتا ہے !

صحیح معنوں میں علامتی افسانہ لکھنے کے سلسلے میں سب سے اہم نام رشید امجد کا ہے، اس نے نہ صرف ایک منفرد اسلوب اختیار کیا، بلکہ کہانی اور اس کے کرداروں کے عقب میں ایک بالکل نئے اور کنوارے منطقے کی تصویر دکھائی۔

وزیر آغا

رشید امجد کے یہاں بیانیہ کا اپنا الگ نشیب و فراز ہے، اپنے قریب ترین پیش رووں میں رشید امجد اس طرح مختلف ہیں کہ یہاں مخصوص ہیئت سے گریز ملتا ہے، رشید امجد کے افسانوں کی ہیئت سلجھانے یا کھلنے والی لذت رکھتی ہے۔ وہ بڑھتے اور پھیلتے ہیں اور بیک وقت کئی جہتوں کے نشیب و فراز سے گزرتے ہیں، ان کے یہاں ماحول کی بے جان اشیاء میں جان پڑ جاتی ہے، ارد گرد کی چیزیں میں افراد کی طرح عمل اور رد عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، اسی طرح زخمی احساسات اور ماحول کی گرانی کو نہ صرف قابل برداشت بناتی ہیں بلکہ اکثر ان میں لطف و انبساط پیدا کر دیتی ہیں، رشید امجد کے افسانے بے معنویت کے خول کو توڑ کر معنی کی نئی فضا میں باہر آتے ہیں، اس بات کی غمازی کہیں تلمیحاتی اشارے اور کہیں نئے فکری زاویے کرتے ہیں۔ وہ موہوم اور لطیف حسیت کی ترنگوں سے روزمرہ زندگی کی شناخت کرتے ہیں، قابل غور بات یہ ہے کہ ان کے یہاں اسطوری عمل کا رجحان ہے یہ اسطوری عمل عصری حسیت کا سانچہ اختیار کرتا ہے اور قدیم اساطیر سے پہلو بچاتا ہے۔

مہدی جعفر